جنبشِ نوکِ قلم

محسن زیدی

قلمی نام : محسنؔ زیدی

نام : سیّد محسن رضا زیدی

پیدائش : ۱۰؍جولائی ۱۹۳۵ء

وفات : ۳؍ستمبر ۲۰۰۳ء

وطن : بہرائچ، اتر پردیش

تعلیم : بی. اے. (انگریزی ادب
تاریخ معاشیات) الٰہ آباد
یونیورسٹی، ۱۹۵۴ء
ایم.اے.(معاشیات) لکھنؤ
یونیورسٹی، ۱۹۵۶ء

پیشہ : ریٹائرڈ جوائنٹ سکریٹری
انڈین اکنامک سروس
گورنمنٹ آف انڈیا

شعری مجموعے:

☆ شہر دل ۱۹۶۱ء

☆ رشتۂ کلام ۱۹۷۸ء

☆ متاعِ آخرِ شب ۱۹۹۰ء

☆ بابِ سخن ۲۰۰۰ء

گذارش

محسن زیدی مرحوم اپنی زندگی میں اپنے چوتھے مجموعے بابِ سخن کے بعد، اگلا مجموعہ منظر عام پر لانے کی خواہش رکھتے تھے لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور یہ خواہش ان کے اپنے ہاتھوں پوری نہ ہو سکی۔

آخر کار آج محسن زیدی کی یہ چھوٹی سی خواہش میں نے پوری کرنے کی کوشش کی ہے اور مرحوم کے تمام اعزاء اقرباء اور احباب کی خدمت میں ان کی باقی تمام غیر مطبوعہ شعری تخلیقات اس مختصر سے مجموعے میں شامل کر کے آپ سب کی نذر کر رہی ہوں خدا کرے میری اس کاوش کو آپ پسند فرمائیں۔

رفیعہ محسن زیدی

۱۸/۵۳، اندرا نگر، لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۱۶

رابطہ: ۲۳۵۶۰۱۸، ۲۳۵۲۲۲۴

مِرا کلام تو کیا ناقدینِ فن محسنؔ
کلامِ حق میں بھی قطع و برید کرتے رہے

جُنبشِ نوکِ قلم

مُحسن زیدی

جملہ حقوق بحقِ رفیعہ محسن محفوظ ©

نام کتاب	:	جُنبشِ نوکِ قلم
نام شاعر	:	مُحسن زیدی (مرحوم)
ناشر و پبلشر	:	رفیعہ زیدی، ۱۸/سیکٹر، مکان نمبر ۵۳/اندرا نگر، لکھنؤ
مُرتبین	:	رفیعہ زیدی، ڈاکٹر بشیشر پردیپ، ڈاکٹر اشفاق محمد خاں
تعداد	:	چار سو
کمپوزنگ	:	آئیڈیل کمپیوٹرس پوائنٹ، چوک لکھنؤ، رابطہ : ۰۵۲۲_۲۰۰۴۴۰۷
طباعت	:	کاکوری پریس، بی۔این۔ورما روڈ، قیصر باغ، لکھنؤ
سن اشاعت	:	۲۰۰۵ء
قیمت	:	۱۵۰ روپئے

کتاب ملنے کا پتہ

دانش محل، امین آباد، لکھنؤ

انتساب

بیتے ہوئے دنوں کے نام

ترتیب

غزلیاتِ محسن

عصری بصیرتوں کا شاعر محسن زیدی

پرفیسر شارب ردولوی

محسن زیدی اردو کے جدید شاعروں میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں انھوں نے اپنی ساری توجہ غزل پر صرف کی اور بڑے خلوص کے ساتھ اس میں اظہار کے نئے زاویے تلاش کرتے رہے۔ محسن زیدی نے تمام عمر ایک خاص سلیقے سے گذاری۔ وہ اپنی کم گوئی کے باوجود بے حد ملنسار اور خوش اخلاق انسان تھے زندگی اور شعروادب کے بارے میں اُن کا ایک نظریہ تھا جس پر وہ گذشتہ نصف صدی کے نشیب وفراز کے باوجود قائم رہے لیکن انھوں نے نہ اس پر کسی سے اصرار کیا، اور نہ کبھی کسی بحث میں الجھے اور نہ اسے خود اپنے لئے اشتہار بنایا۔ وہ شاعر تھے اور صرف شاعر۔ وہ ساری زندگی بڑے خلوص اور سچائی کے ساتھ جو دل پر گذرتی ہے اسے رقم کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری اُن کے محسوسات کی بہترین تصویر ہے۔

محسن زیدی غزل کے شاعر ہیں اور غزل ایک ایسی صنف سخن ہے جو شاعر کے اظہار و بیان کا امتحان لیتی ہے اور یہ شاعر کے ہنر پر منحصر ہے کہ وہ اس میں معنی کے کتنے گوشے اور کتنے پہلو پیدا کرسکتا ہے غزل کی دنیا اس کے استعارے اور

علامات ہیں اس معاملے میں محسنؔ زیدی کی غزلیں خاص توجہ کی مستحق ہیں، اس لئے کہ ان میں زندگی کے بے شمار رنگ نظر آتے ہیں اور ان رنگوں کے پیچھے چھپی ہوئی معنویت اسے زندگی کے وسیع منظرنامے میں بدل دیتی ہے۔

محسنؔ زیدی کا تعلق اُس نسل سے ہے جس نے غلام ہندوستان سے لے کر آزاد ہندوستان کی نصف صدی سے زائد دیکھی۔ اس عرصہ میں تاریخ بہت تیزی سے آگے بڑھی اور اپنی تیز رفتاری میں اس نے اپنے پیروں تلے کیا کچھ روند ڈالا اس کا نہ اسے احساس ہے اور نہ مورخ کے پاس اس کی تفصیل۔ یہ باتیں صرف ادب میں محفوظ رہ جاتی ہیں اور آنے والے زمانے میں صرف ادب ہی ان تصویروں کو دکھا پاتا ہے اس لئے محبت کی خوشبو ہو یا پیراہن محبوب کی رنگینی یا مکانوں کے جلنے کے دھوئیں کی بو یا فسادات اور عدم تحفظ کا احساس، ان سب کے محسوس کرنے کے لئے دل کی ضرورت ہوتی ہے اور تاریخ کے پاس دل نہیں ہوتا اسی لئے تاریخ کے مقابلے میں ادب میں کسی عہد کی زیادہ بہتر تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ محسنؔ زیدی نے ان تصاویر کو الفاظ میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے

محسنؔ اتنی ارزاں کب زندگی رہی ہوگی
اس طرح ہوا ہوگا نقدِ جاں کا سودا کب

ہمارے عہد میں زندگی کی جو ارزانی ہے اس کی اس سے بہتر تصویر کیا ہو سکتی ہے۔ آج کس کی زندگی محفوظ ہے؟ جو بڑے اور مہذب ممالک کہلاتے ہیں انھوں نے ترقی پذیر ممالک کی دنیا تنگ کر رکھی ہے اس سے الگ صبح سے شام تک کے واقعات پر نظر ڈالیے تو محسنؔ زیدی کے شعر کی سچائی خود بخود سامنے آنے لگے گی۔

محسنؔ زیدی نے دہلی کے قیام کے زمانے میں ۱۹۸۴ء کے فسادات دیکھے تھے انھوں نے گھروں سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں میں انسانوں کے جلنے کی بو محسوس کی تھی اس طرح ہر فساد ان کے احساس دل پر ایک زخم کا اضافہ کر گیا اور ہر زخم ان کے اشعار میں لو دینے لگا

کیا دیکھتے ہو راہ میں رک کر یہاں وہاں
ہے خاک و خوں میں ایک سا منظر یہاں وہاں

شیشے کے سب مکاں ہیں شکستہ اِدھر اُدھر
بکھرے پڑے ہیں شہر میں پتھر یہاں وہاں

اور اسی غزل کا ایک شعر بڑی عجیب نفسیاتی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے فساد جس شہر میں ہو قتل و غارت گری تو ہوتی ہی ہے لیکن جہاں فساد نہیں ہوتا وہاں کی زندگی پر بھی خوف اور دہشت طاری رہتی ہے کہ معلوم نہیں کس لمحے کیا ہو جائے۔

محسنؔ کے الفاظ میں خوف اور دہشت کی یہ تصویر اس عہد کا ایک تکلیف دہ اور افسوس ناک المیہ ہے

ہے درمیان خنجر و سر فاصلے کا فرق
ورنہ سروں پہ ہے وہی خنجر یہاں وہاں

فسادات پہلے بھی ہوا کرتے تھے جن کے پیچھے سیاسی یا بعض مذہبی جماعتوں کا ہاتھ ہوتا تھا لیکن اب صورتِ حال تبدیل ہوگئی ہے اب اُن فسادات میں حکومت اور انتظامیہ کی شہ بھی شامل ہوتی ہے۔ محسنؔ کے یہ اشعار انھیں المناک مناظر کی تصویریں ہیں

امیر شہر سبھی تھے شریکِ مشقِ ستم
کسی نے کم تو کسی نے ستم زیادہ کیا

☆☆☆

جب تھا محافظوں کی نگہبانیوں میں شہر
قاتل فصیلِ شہر کے اندر کہاں سے آئے

☆☆☆

سنتے ہیں کہ آباد یہاں تھا کوئی کنبہ
آثار بھی کہتے ہیں یہاں پر کوئی گھر تھا

☆☆☆

کس کا سر کس کی ردا کس کا مکاں ڈھونڈتے ہو
قتل و غارت میں تو کوئی نہ بچا کچھ نہ رہا

☆☆☆

آبادیوں کے لٹ گئے آثار سب کے سب
تاراج ہو گئے در و دیوار سب کے سب

☆☆☆

چراغوں کے تو جلنے کا دھواں ایسا نہیں ہوتا
چراغوں کے یہ بجھنے کا دھواں ہے کیوں نہیں کہتے

☆☆☆

شہر میں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں
گونگے بہرے ہیں سارے اخبارات

☆☆☆

ایک زمانہ تھا کہ بستی میں کسی کی موت ہو جاتی تھی تو گھروں میں چولھے نہیں جلتے تھے محلے کا ہر گھر سوگوار نظر آتا تھا۔ اب ایسی بے حسی کا زمانہ ہے کہ ان قیامت خیزیوں کے باوجود زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس بے حسی پر محسنؔ زیدی کا ایک شعر دیکھئے

؎

سر قلم ہو گئے کتنوں کے مگر

جیسے کچھ بھی نہ ہوا سب خاموش

محسنؔ زیدی کی شاعری میں کربلا کے تلازمات کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے کربلا ہر ظلم و جبر، ناانصافی اور حق تلفی کے خلاف احتجاج کی علامت ہے، کربلا آج بھی مظلوم و مجبور کی طاقت ہے وہ ان واقعات سے ظلم و ناانصافی کے خلاف صف آرا ہونے کی طاقت حاصل کرتا ہے۔ اردو شاعری میں یوں تو واقعۂ کربلا کا حوالہ پہلے بھی آتا رہا ہے لیکن گذشتہ دو تین دہائیوں میں بیشتر شعراء نے واقعۂ کربلا کو استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے اور موجودہ زمانے کے کرب و ظلم و ناانصافی، حق تلفی اور جبر کربلا کے تلازمات میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ محسنؔ زیدی کربلا کے استعارے اور تلازمات کو اپنے عہد کی سنگ دلی اور مظالم کے اظہار کے لئے بڑی خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں

؎

کہاں آکر لٹا گھر بار اپنا
یہ بستی بھی ہے دشت نینوا کیا

☆☆☆

مشعلیں سر کی سجائی گئیں طشت زر میں
کب سے مقتل میں چراغاں نہ ہوا تھا سو ہوا

☆☆☆

ساری تیغیں ہیں اک گلو کے لئے
سارے تیروں کا ہے نشانہ ایک

☆☆☆

کٹے گی فصل سروں کی کہ شمر ہے موجود
چھدیں کے سب کے گلے حرملہ کے ہوتے ہوئے

☆☆☆

جُنبشِ نوکِ قلم ہی سہی خنجر کے خلاف
کوئی میدان میں آئے تو ستمگر کے خلاف

☆☆☆

وقت بتائے گا، کون جنگ میں سرخرو ہوا

آج کسی کی فتح کیا آج کسی کی ہار کیا

☆☆☆

کہیں نہ آب نہ برگ و گیاہ دور تلک

یہ پا پیادہ سرِ دشت تشنگی کا سفر

☆☆☆

محسن زیدی کی نگاہ میں یہ دنیا خود ہی معرکۂ کربلا ہے جہاں ہر وقت ناانصافی وحق تلفی کا سامنا ہے یہاں کون ہے جو کسی ناانصافی کا شکار نہیں۔ محسن نے بڑے خوبصورت انداز میں اسے ایک شعر میں نظم کیا ہے

ہے معرکۂ کرب و بلا اصل میں دنیا

بازیچۂ اطفال کو دنیا نہیں کہتے

محسن زیدی کی شاعری اگر ایک طرف عصری صداقتوں کی تصویر کشی کرتی ہے تو دوسری طرف زندگی کے حسین اور خوشگوار لمحات اور اس کی نرمی و دلکشی کی عکاسی بھی کرتی ہے جو محسن کے احساسِ جمال اور غزل کی اس نرمی و حلاوت کو پیش کرتی ہے

جسے غزل کی تہذیب کہا جاتا ہے اور جس نے غزل کو ایک صنفِ لطیف بنا دیا ہے محسن نے غزل میں مختلف طرح کے تجربات و محسوسات کو نظم کیا ہے ان کی غزل میں تہذیبی قدریں بھی ہیں اور نازک احساسات بھی، اس میں زمانہ کی تلخی بھی ہے اور حالات کا شکوہ بھی، لیکن کسی جگہ غزل کی تہذیب کا دامن ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا ہے

اسے تلاش کروں جا کے کس دیار میں اب
دیا تھا اس نے تو اپنا پتہ یہیں کا مجھے

☆☆☆

یہ تو دنیا ہے بدلتی رہتی ہے اس کی نظر
جس قدر یہ آشنا ہے اُس قدر نا آشنا

☆☆☆

تیشۂ شب سے رات بھر کون ہوا لہولہاں
کون نگارِ صبح کے رخ پہ گلال مل گیا

☆☆☆

ساتھ چلے تھے سب مگر یاد کسی کو کچھ نہیں
کون کہاں ٹھہر گیا، کون کدھر نکل گیا

☆☆☆

محسن زیدی کی شاعری کی ایک خصوصیت ان کے اظہارِ بیان کی سادگی ہے ان کے یہاں جذبات کے اظہار میں کسی طرح کا کوئی تصنع نہیں ہے۔ بعض لوگ شاعری میں خیال آرائی، علامت نگاری اور پیچیدہ بیانی کو بہت اہمیت دیتے ہیں اردو شاعری میں ماضی قریب کی علامت نگاری اور پیچیدہ بیانی پر بہت زور دیا گیا اور ناقدین نے ان علامتوں اور استعاروں کی تفسیر بیان کرنے میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے۔ علامت غزل یا شاعری کا ایک حُسن ہے لیکن اگر اس کا استعمال غیر ضروری طور پر ہونے لگے تو قاری کی معنی تک رسائی ناممکن ہو جائے گی اور شاعری ابہام کا شکار ہو کر رہ جائے گی۔ گذشتہ صدی کی چھٹی و ساتویں دہائی میں نثر و نظم دونوں اس طرح کے ابہام اور بے دریغ علامت نگاری کا شکار ہوئے جس کے نتیجے میں مصنف اور قاری کا رشتہ ٹوٹ گیا جس کا احساس مصنف کو کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد ہوا، محسن زیدی اس عہد سے بھی گذرے لیکن انھوں نے اپنے اسلوب کو نہیں بدلا انھوں نے چونکانے اور مرعوب کرنے کے لئے عجیب و غریب موضوعات اور علامتوں کو اپنی شاعری کا حصہ نہیں بننے دیا انھوں نے ہمیشہ سادگی اور کیفیت پر زور دیا، یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری دل کو چھوتی ہے اور پڑھنے والے میں اپنائیت کا احساس پیدا کرتی ہے۔ ان کے اشعار بظاہر سادہ ہوتے ہیں لیکن ان میں ایک فکری گہرائی اور بصیرت کا پہلو پوشیدہ ہوتا ہے مثلاً ان کے یہ چند اشعار دیکھیے

پہلے ہی سے ہم سمتِ سفر کیوں نہ بدل لیں
اس موڑ کے آگے ہے اگر راہ گذر بند

☆☆☆

کہا کچھ تھا زمانے نے سنا کچھ
فسانہ کچھ تھا لیکن بن گیا کچھ

☆☆☆

چلے تو تھے ہوا کے رخ پہ لیکن
بدلتی جا رہی ہے رخ ہوا کچھ

☆☆☆

ایسا نہیں کہ اور ستمگر نہ آئیں گے
لیکن تمھارے قد کے برابر نہ آئیں گے

☆☆☆

یہ تو دنیا ہے چپ نہیں ہوگی
روز نکلے گا شاخسانہ ایک

☆☆☆

بخیہ گروں سے کارِ رفو بھی نہ ہو سکا

پیراہن حیات شکستہ رہا تمام

☆☆☆

یہ چند اشعار محسؔن زیدی کے مزاج اور فکر و فن کی واضح تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان اشعار پر اگر غور کیا جائے تو زندگی کے بارے میں ان کے رویّے اور ان کی فکر کو سمجھا جا سکتا ہے۔ محسؔن زیدی کو بعض لوگوں نے کلاسیکی روایت سے وابستہ شاعر کہا ہے کسی کے خیال میں وہ ترقی پسند شاعر ہیں۔ بعض نے جدیدیت کے حوالے سے ان کے اشعار کا ذکر کیا ہے، محسؔن کے سلسلے میں یہ تقسیم مناسب نہیں وہ ایک انسان دوست شاعر ہیں اور یہی نظریہ ان کا بنیادی نظریہ ہے۔ حالات انھیں شدّت سے متاثر کرتے ہیں اور یہی اثرات ان کے تخلیقی عمل کا حصہ بن جاتے ہیں وہ دنیا میں حُسن محبت اور امن دیکھنا چاہتے ہیں اپنے بیان کے لئے کسی نظریہ یا رجحان کے مطابق شعوری طور پر الفاظ، استعارے یا علامتیں استعمال نہیں کرتے بلکہ کسی خیال کا اظہار فنی طور پر جن الفاظ میں خوبصورتی کے ساتھ ہو سکتا ہے وہ انھیں الفاظ کو استعمال کرتے ہیں۔

رکھیں کس رخ پہ ہم جلا کے چراغ

کب کدھر سے چلے ہوا ہے عجب

☆☆☆

ہر شخص یہاں گنبد بے در کی طرح ہے
آواز پہ آواز دو سنتا نہیں کوئی

☆☆☆
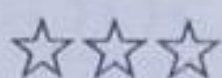
اب اجالے کے لئے بھٹکا کرو
گر گیا سورج تو اندھے غار میں

☆☆☆

بہتر ہے رہنے دیجئے یوں ہی پیرہن کو چاک
کارِ رفو میں ویسے بھی زحمت زیادہ ہے

☆☆☆

ہر ایک پیڑ سے لپٹے ہوئے ہیں سانپ یہاں
بنی ہوئی ہے ہر اک شاخ، شاخِ صندل کیوں

☆☆☆

دکھائی پڑتی ہیں تصویریں سب ادھوری سی
حیات کا کوئی خاکہ نہیں مکمل کیوں؟

☆☆☆

اے اجل نذر اور کیا کرتے
پاس اپنے تھا صرف نقدِ حیات

☆☆☆

غزل اردو شاعری میں ایک آسان صنفِ سخن سمجھی جاتی ہے، لیکن اس میں اپنا منفرد لب ولہجہ بنانا اور اپنی انفرادیت کو قائم رکھنا اتنا ہی مشکل کام ہے لیکن محسنؔ زیدی کی غزلوں میں خیال کی تازہ کاری بھی ہے، شدتِ احساس بھی اور اظہار کی ہنر مندی بھی۔ ان کی شاعری کا ایک پہلو بے ساختگی ہے ان کے یہاں خیالات کا ایک بہاؤ ہے جو ایک کے بعد ایک تصویر کو پیش کرتا چلا جاتا ہے

یہ کون سیر چمن کو نکل پڑا دمِ صبح
چمن میں کھل اٹھے سارے گلاب ایک ہی ساتھ

☆☆☆
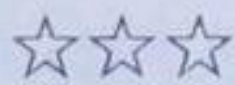
جو سوچتا رہا نہ بیاں کر سکا ہنوز
الفاظ کا خیال پہ پہرہ رہا تمام

☆☆☆

نسیم صبح دبے پاؤں جانے کب آئی
نہ جانے رہ گذرِ خواب سے وہ کب گذرے

☆☆☆
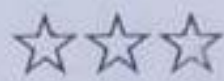
رہتا ہے کوئی شخص مرے دل کے آس پاس
میں نے اسے قریب سے دیکھا نہیں تو کیا

☆☆☆

اس دھوپ کے سفر کا اگر قصد ہے تو پھر
گھر پر خیالِ سایۂ دیوار رکھ کے آؤ

☆☆☆

اک قرضِ آخری تو چکانے کی بات ہے
اس شہر میں اب اور ٹھہرنا نہیں مجھے

☆☆☆

محسنؔ زیدی کی شاعری نے بہت سے ادبی نشیب و فراز اور تحریکوں کے عروج و زوال دیکھے لیکن ہر زمانے میں انھوں نے اپنے لہجے کی انفرادیت کو باقی رکھا۔ یہی ان کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

ایک تاثر

علی جواد زیدی

خوش مزاج و خوش طبیعت پاک طینت نیک نام

کر قبول اے بھائی محسن آخری میرا سلام

تم کو تو خوردی بزرگی کی رہا کرتی تھی فکر

اک ذرا رک کر روایت کا تو کرتے احترام

موت کی لیکن روایت اور ہے تم کرتے کیا

اُس کو کیا پروا، ہو کوئی سُست رویا تیز گام

محفل شعر و ادب پر اک اندھیرا چھا گیا

مشکلوں سے آئے گا اب اور تجھ سا خوش کلام

تجھ کو ہر صنفِ سخن پر ایک قدرت تھی نصیب

وہ قصیدہ ہو غزل ہو نعت ہو یا ہو سلام

معنیٔ تازہ کی حامل ہر علامت ہو گئی

صدیوں پر پھیلی ہوئی فکریں بنیں عطرِ کلام

ہر غزل میں تازگی تھی اور صنفی التزام

اک ابھرتا سا نظام اور اک نکھرتا سا نظام

آج دلّی ہو بنارس ہو کہ شہرِ لکھنؤ

چاہتے ہیں لوگ تجھ سے پھر سنیں تازہ کلام

یاد کرنے کے سِوا ہم اور کر سکتے ہیں کیا

تیرے مجموعوں سے کچھ تسکین ہو گی لا کلام

☆☆☆

منفرد لہجے کا شاعر محسنؔ زیدی

ڈاکٹر اشفاق محمد خاں

محسنؔ زیدی کے پہلے شعری مجموعے ''شہر دل'' ۱۹۶۱ء سے لے کر چوتھے مجموعہ کلام ''باب سخن'' ۱۹۹۷ء تک کا تخلیقی سفر خاصا طویل سفر ہے۔ زیدی صاحب بڑے خوش نصیب شاعر ہیں جنہوں نے گذشتہ ۵۰ سال میں شعر و ادب کے اصلاحی اور انقلابی کئی نشیب و فراز دیکھے، ان کی شاعری کی ابتداء ترقی پسند تحریک کے شباب سے ہوئی۔ یہ زمانہ عجیب و غریب زمانہ تھا کہ جب ترقی پسند نظریات کے تحت ہر طرف سماجی حقیقت نگاری کا چرچا عام تھا ادب کے ذریعہ سماجی شعور کی بیداری اور سماجی انقلاب کا نعرہ ہر ترقی پسند شاعر کا فرض اولیں تھا اور ساتھ ہی کچھ مخصوص موضوعات پر شعر کہے بغیر ترقی پسند شاعر ہونے کا مستحق نہ سمجھا جاتا تھا۔ نظریاتی وابستگی (Commitment) ترقی پسند ادیب یا شاعر ہونے کی ایک سند تھی۔ اس قید و بند کے نتیجے میں اُردو کے ترقی پسند غزل گو اور نظم گو شعراء کی فہرست محدود ہو کر رہ گئی یعنی سوائے فیضؔ، مجازؔ، جذبیؔ، ساحرؔ، مجروحؔ، سردار جعفریؔ، کیفی، جاں نثار اخترؔ اور تاباںؔ کے کوئی نیا نام عرصہ دراز تک شامل فہرست نہ ہوا۔ اختر الایمان کو بھی بہت بعد

میں شامل کیا گیا اور یہ فہرست ایک طویل عرصہ تک اُردو کے ادبی رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتی رہی۔ ان شعراء کرام کے ساتھ ہی مگر پیچھے پیچھے خاصے باصلاحیت شاعر حسرت سے ان سب شعراء گرامی کے ناموں کا شمار کرتے مگر جب اس فہرست میں اپنے نام نہ پاتے تو دل میں خاموش احتجاج کرتے رہتے۔ لیکن تا کجا؟۔ بالآخر ایک دن معلوم ہوا کہ شعراء اور ادیبوں کا ایک نیا گروہ کچھ نئی ہیئت اور نئے موضوعات سے لیس ہو کر میدان میں اتر رہا ہے۔ ان میں سے بعض نئے لکھنے والے اور بعض ترقی پسندوں کی اجارہ داری کو ختم کرنے والے نوجوان تھے جو ماضی میں تحریک سے وابستہ بھی رہے تھے مثلاً باقر مہدی، خلیل الرحمن اعظمی، مظہر امام، زبیر رضوی، شہریار، شاذ تمکنت، کمار پاشی، کرامت علی کرامت، محمد علوی، بشیر بدر، مخمور سعیدی وغیرہ وغیرہ۔ اس نئے گروپ نے ترقی پسند تحریک کے منشور سے ہٹ کر شعر و ادب میں ہیئت اور موضوع کے آزادانہ تجربوں میں غزل اور نظم کے صوری اور معنوی حسن کو طرح طرح سے آراستہ کرنے کی کوشش کی مگر تاہم یہ حضرات ادب کو یا زندگی کو اتنا بھی نہ دے سکے جتنا ترقی پسندوں نے دیا تھا۔ شاید اس لئے کہ ان کے یہاں کوئی واضح مقصد یا نقطۂ نظر نہ تھا اور ان کو اندھے کی لکڑی پکڑ کر چلنا پڑا، ترقی پسندوں نے ہمیشہ شعر و ادب کو تجربے کا بیان سمجھا جب کہ نئے گروپ نے شاعری کو بیان کا تجربہ کہا۔ ترقی پسند فنکاروں نے ہزار غلطیوں کے باوجود زمین، آدمی اور

انسانی اقدار اور سماجی مسائل پر غور وفکر اور ان کے حل تلاش کرنے کے لئے قلم کا استعمال کیا۔ اسی مقام سے اُردو کے ادیب شاعر اور دانشور دو صفوں میں منقسم ہو گئے۔

غرض کہ ۱۹۶۴ء کے بعد تیزی سے ترقی پسند تحریک کے اضمحلال کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصے تک جمودی کیفیت طاری رہتی ہے۔ موقع پرستوں کو اس جمود کو توڑنے اور ترقی پسند تحریک کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کی سازش کا موقع مل جاتا ہے۔ چنانچہ سکوت اور سناٹے کی فضا میں ''جدیدیت'' کا لفظ وبا کی طرح پھیل جاتا ہے۔ اور ہر طرف سے دانائے راز سوتے سے جاگ کر اس لفظ کی معنویت اور تعریف طرح طرح سے بتانے میں مصروف ہو جاتے ہیں، کوئی اسے رجحان کہہ رہا تھا تو کوئی مصر تھا کہ یہ تحریک ہے اور کچھ کا کہنا تھا کہ یہ ترقی پسند تحریک کی توسیع ہے۔

بہر حال جدت اور جدیدیت کی درآمدی (Imported) وبا نے ترقی پسند تحریک پر یقیناً منفی اثر ڈالے اور نئی نسل کے بڑے باصلاحیت نوجوانوں کی ترقی پسندی کے خلاف ایک صف میں کھڑا کر دیا۔ اتفاق سے ان نوجوانوں کو بعض معتبر رہنما بھی مل گئے جنہوں نے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور سہارا بھی دیا یعنی اپنے ادبی رسائل یا اخبارات کے صفحات میں ان کی مہمل تخلیقات شائع ہونے لگیں اور وہ

آناً فاناً نظم گو شاعر غزّاں بن گئے۔ اس طرح گذشتہ ۳۰ رسال میں ان جدید تر شعراء نے اپنی لایعنی اور نا قابلِ فہم کا ہزاروں ٹن کاغذ بے فیض و بے مراد برباد کیا، مغرب کے اس طرح کے زوال آمادہ رجحانات کے زیر اثر ہمارے فنکاروں کے یہاں بھی مسلسل کرب، گھٹن، تنہائی، بے بسی اور سرتاپا مایوسی کے خیالات واحساسات سرایت کر گئے۔ ہمارے جدید دانشوروں نے بھی اس رجحان کو جوں کا توں قبول کرلیا۔ اس کے نتیجے میں ہر جگہ تعلیمی اداروں میں ''جدیدیت اور ادب'' کے موضوع پر بڑے بڑے سمینار منعقد کیے گئے جن میں مستند دانشوروں اور ادیبوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا (بحوالہ علی گڑھ یونیورسٹی ۱۹۶۹ء) اظہارات میں (Commitment) وابستگی کا لفظ بھوت کی طرح مسلط محسوس کیا گیا۔ یہ لفظ آج تک بعض حضرات استعمال کرتے ہیں جب کہ اس کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ جدید حضرات، جدیدیت کی صحیح تعریف بتانے سے ہنوز قاصر ہیں۔

مناسب ہوگا اگر یہاں جدیدیت کی بدعت سے متعلق ایک دانائے راز کا قول نقل کر دیا جائے جو جدیدیت کی فکر وفہم رکھنے والوں کی تعریف سے قریب تر معلوم ہوتا ہے۔

''اردو میں کہانی لکھنے والا اس قومی اور بین الاقوامی شعور کی طرف سے آنکھیں بند کیے بیٹھا آدمی انسان اور اس کے دُکھ اور اس کی جدوجہد اور اس کی شہادت اور اس کی فتح کا باب لکھنے کے بجائے محض چھپکلی کی رینگتی کراہت رقم کر سکا۔ اس نے اپنی موجودگی کو اور انسان کو ترک کر دیا۔ اس نے وجود کا ترجمہ عدم کیا اور خوف کا پرچار کیا۔ اس نے تنہائی کو Fetish بنا دیا۔ وہ اس فقیر سے مشابہ نظر آیا جو اپنی پنڈلی پر کلیجی باندھ کر بیٹھ جاتا ہے اور ہر آنے جانے والے کو یہ زخم دکھا دکھا کر بھیک مانگتا رہتا ہے۔ یہ تنہائی خون کی خرابی یا اس کے دباؤ میں کمی یا زیادتی سے پیدا ہوتی ہے۔ زندگی اور حسن سے ''مادر زاد'' نفرت سے پیدا ہوتی ہے بینک بیلنس پر ہر وقت نگاہ رکھنے سے پیدا ہوتی ہے'' (خ۔۱)

جدیدیت زدہ افراد کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی اور بالآخر یہی ہوا کہ کچھ ہی عرصہ بعد اس رجحان کے بادل بھی چھٹنے لگے شاید اس لئے کہ یہ ایک منفی اور مجرمانہ سازش تھی ترقی پسندیت کے خلاف جو کامیاب نہ ہو سکی۔ جدیدیت کے پاس کوئی عقلی بنیادوں پر مضبوط فلسفہ نہ تھا جب کہ ترقی پسند تحریک اور سرسید تحریک کے پاس جاندار نظریات تھے اور ان کی جڑیں سراسر زمین یعنی انسانوں سے منسلک رہیں اسی لئے یہ دونوں تحریکیں آج بھی کسی نہ کسی طرح سے زندہ ہیں اور یہی ان جدیدیوں

کے لئے سب سے بڑی پریشانی ہے اور یہ پریشانی قومی اور بین الاقوامی دونوں سطح پر موجود ہے۔ چنانچہ جدیدیت کے علمبردار وقتاً فوقتاً اپنے وجود کو تسلیم کرانے کی غرض سے کوئی نہ کوئی نیا نعرہ اصطلاح کی شکل میں پیش کرتے رہتے ہیں کچھ ماہ پہلے جدیدیت کو زندہ کرنے کے لئے ''مابعد جدیدیت'' پر سمینار ہو چکا ہے۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ اگر کسی فلسفے یا نظریے کی بنیاد قوت عقلی پر ہے تو وہ دیرپا ثابت ہو سکتا ہے اور اگر وہ ہوائی فلسفے سے تعلق رکھتا ہے تو سراسر بے جان ہی رہے گا اور زیادہ دن نہیں چلے گا۔ یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ہمارے ہندوستانی سماج میں صرف دو نظریوں کی بنیاد پر الگ الگ دو تحریکیں وجود میں آئیں یعنی علی گڑھ تحریک اور دوسری ترقی پسند تحریک۔ یہ دونوں نہایت جاندار نظریات اور فلسفے سے وابستہ رہی ہیں اور ان کی جڑیں سراسر زمین یعنی آدمی سے منسلک رہی ہیں، اس لئے یہ دونوں تحریکیں آج بھی کسی نہ کسی طرح سے زندہ ہیں حالانکہ انھیں مسلسل نقصان پہونچانے کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔ نقصان پہونچا بھی ہے۔ تاہم یہ دونوں تحریکوں کی بنیادیں ابتدا سے بہت مضبوط اور بمقتضائے حال ہیں، اس بناء پر اس بات کا غالب امکان ہے کہ عہد جدید کے باشعور صحت مند سماجی ادیب اور فنکار کچھ اہم تبدیلیوں کے ساتھ ان تحریکوں کے احیاء کے لئے میدان میں تشریف لائیں اور نیا منشور پیش کریں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم احیا میں کامیاب نہ ہوں۔ سماجی

حالات اس احیا کے مقتضی اور منتظر بھی ہیں۔

شاعری کی اس روایت اور قدر و منزلت کی روشنی میں محسنؔ زیدی کے کلام کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے، یہاں زمین، زندگی اور زندوں سے وابستہ محسنؔ زیدی کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیے

مرے قلم نے نہ باطل کا تذکرہ لکھا
مآل کچھ بھی ہوا حرفِ حق سدا لکھا

☆☆☆

لوگ اسناد کے کشکول لئے پھرتے ہیں
کتنا بے سود ہے اس دور میں لکھنا پڑھنا

☆☆☆

جدا ہوں سب سے تو انبوہ میں نہ شامل کر
مجھے الگ سے کوئی شخصیت نمایاں دے

☆☆☆

لکھی ہے بادیہ پیمائی جب مقدر میں
مرے جنوں کو بھی وصفِ غمِ غزالاں دے

اس دشت میں تھا اندھا کنواں ہی مرا نصیب

کچھ فرق دشمنوں نہ سگے بھائیوں میں تھا

☆☆☆

اوپر جمی ہوئی تھیں تہیں رسمیات کی

پانی تعلقات کا گہرائیوں میں تھا

☆☆☆

ایسا نہیں کہ اور ستمگر نہ آئیں گے

لیکن تمہارے قد کے برابر نہ آئیں گے

☆☆☆

ان تمام اشعار میں کوئی بات اسطوری یا سماوی نہیں ہے جو کچھ ہے ارضی ہے۔ اور نہ ہی ان میں مہمل، مبہم اشاریت کا عمل دخل ہے جو بات بھی کہی ہے وہ زندگی کے گہرے تجربے پر مبنی ہے اور دل سے نکلی ہے۔ وہ شاعری کو تجربے کا بیان سمجھتے ہیں۔ بیان کا تجربہ نہیں۔ اس طرح سماجی حقیقت نگاری زیدی کی پہچان بن

جاتی ہے ملاحظہ فرمائیں ۔

یہ ظلم دیکھئے کہ گھروں میں لگی ہے آگ

اور حکم ہے مکین نکل کر نہ گھر سے آئیں

☆☆☆

کیا بات تھی کہ جس کا درندوں کو ڈر رہا

اب کے لہو کا دور بہت مختصر رہا

جھپکی پلک تو ٹوٹ گیا رشتۂ کلام

الفاظ کا سفر تھا بہت مختصر رہا

انا کی حماقت

گھر چھوڑ کے نکلے ہو عبث کیوں تنِ تنہا

ہر شخص تو گھر چھوڑ کے گوتم نہیں ہوتا

اس سے زیادہ اور کیا قیامت ہو سکتی ہے۔

وہ زمیں بوئے گئے دشنہ و خنجر جس میں

وہ کوئی لعل و جواہر تو اُگلنے سے رہی

میرؔ کے لہجے اور زمین میں۔

منہ سے کہتا نہیں کچھ بس یہی مجبوری ہے

دیکھتا میں بھی ہوں تصویر بنا کیا کیا کچھ

کس معصومیت سے اپنی پیاس کا تعین کرنا چاہتے ہیں۔ تہ داری اور بلاغت کا کمال ہے۔ فرماتے ہیں:

پیاس کا اپنی تعین نہیں مقصود کہ میں

دیکھنا چاہوں گا دریا میں ہے پانی کتنا

اور بالآخر

مختصر یہ کہ اسی طرح جُھلَستے رہئے

ابر آنے سے رہا دھوپ بھی ڈھلنے سے رہی

اور جب کبھی بے یقینی کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو کس قدر خوبصورتی سے فرماتے ہیں:

آنکھوں میں جذب کرلو یہ منظر کہ اس کے بعد

آئینہ، آب عکس ہوا ہونے والا ہے

محسؔن زیدی نے اپنے بیشتر کلام میں عصری زندگی کی سفاکی، محرومی اور نا آسودگیوں کو نہایت سادہ، بے تکلف اور غیر مبہم انداز سے پیش کیا ہے۔ استعاراتی اور علاماتی حسیاتی پیکروں کی تلاش ان کے یہاں عبث ہے۔ انھوں نے اپنے افادی نقطۂ نظر کے پیش نظر ترقی پسند دور عروج کا برہنہ اور براہ راست انداز و اظہار روا نہیں رکھا اور اپنی فنکارانہ کاوشوں میں ادب کی افادیت اور غایتی قدروں کو ہمیشہ اہمیت دی۔ ان کی غزلوں میں الگ الگ بصری، حرکی اور سماجی پیکر نظر آتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ انھوں نے روایت، ترقی پسندیت اور جدیدیت تینوں کی یلغار و اور رویوں سے گزر کر تن تنہا آج تک غزل میں سماجی مقصدیت کے موضوعات ہی رقم کرتے رہے۔ اس روش پر محسؔن زیدی کی دور بینی اور دروں بینی کی داد دینا پڑتی ہے کہ از سر نو حلقۂ ارباب ذوق کے دل و دماغ سے نکل کر زبان خلق تک شعر و ادب میں سماجی افادیت اور حقیقت نگاری کی ضرورت پر بات چل پڑی ہے۔ نہ صرف ہمارے یہاں بلکہ باہر کے ملکوں میں بھی جدید دور کے نا گفتہ بہ حالات کے تحت ادب کی سماجی افادیت کے مسئلے پر غور و خوض کیا جا رہا ہے۔ ہائڈل برگ (جرمنی) یونیورسٹی کی اُردو کی پروفیسر کرسٹنا اوسٹر ہیلڈ (Cristina Oesterheld) نے مجھے ایک خط میں تحریر کیا ہے:

''یہاں دو تین ہفتے پہلے ایک بڑے اخبار میں نئی نسل کے ایک مصنف کا مضمون چھپا تھا۔ جس میں موصوف نے ادب کی سماجی افادیت اور ذمہ داری پر زور دیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ادب اور زندگی کے گہرے تعلق کا احساس تو ابھی بھی بہت سے ادیبوں کو ہے یہاں بھی اور ہندوستان، پاکستان میں بھی۔ پاکستان میں ترقی پسند رُجحان خاصا طاقتور ہے۔ اس لئے میں تو ادب اور ادیبوں سے نا امید نہیں ہوں''۔

اس طرح محسؔن زیدی کو ہم حال اور مستقبل کا شاعر کہے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اُنھوں نے ماضی میں جو انقلابی زمانہ دیکھا اس کے مقابلے میں آج ان پر جو کچھ گزر رہی ہے اس کا عکس ان کے کلام میں دیکھا جا سکتا ہے اور جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے کے مصداق ان کا قلم آج بھی رواں دواں ہے جب کہ ان کے بیشتر ہمعصر احباب یا تو تائب ہو کر جدیدیت کی بھول بھلیوں میں پھنس چکے ہیں اور بے معنی و مبہم شعر گوئی یا افسانہ نگاری کو فن کا عروج سمجھ کر جھوٹی خوش فہمی کا شکار ہیں یا پھر ان کی فکری اور فنی صلاحیتیں وقت سے پہلے جواب دے چکی ہیں۔ مگر محسؔن زیدی ایک لمحے کے لئے بھی نہیں ڈگمگائے شاید اس لئے کہ انھوں نے اپنی شاعری کا رشتہ انسانوں کے احساسات، جذبات اور ان کے پیچیدہ ناگفتہ بہ حالات سے منسلک رکھا

اوران کے اظہار مین اپنی کلاسیکی فنی روایت کو بھی گلے سے لگائے رکھا اور خود کو آزاد نظم ،نثری غزل، جیسے حماقت آمیز تجربوں سے بھی محفوظ رکھا۔ موصوف نے شاعری کو تجربے کا بیان سمجھا، بیان کا تجربہ نہیں ان کی شاعری کی بنیاد غم دوراں پر ہے غم جاناں پہ نہیں۔ اور بھی غم ہیں محبت کے سوا کا معاملہ آج بھی جوں کا توں ہے۔

اک تخیل ہوں جو لفظوں کے احاطے میں نہیں

ڈھونڈھتے ہو تم مجھے الفاظ کے اندر کہاں

☆☆☆

اس کے بیانِ حق میں جو پہلو ریا کا تھا

وہ گفتگو کے فن سے نبھا لے گیا اسے

☆☆☆

آئینہ میں اب کچھ ہے نہ آئینہ گری میں

ہر شخص گرفتار ہوا کم نظری میں

☆☆☆

چاروں طرف بلند نشاں تیرگی کا تھا

رکھا ہوا فصیل پہ سر روشنی کا تھا

☆☆☆

کرنے دو آج اس کو قلم روشنی کا سر

دیکھو وہ کل جو ہاتھ نہ ملتا دکھائی دے

☆☆☆

مجھ کو دیکھو کہ لڑا میں تنِ تنہا کیسے

اس کی نصرت کو تو کُل نوعِ بشر ساتھ رہی

☆☆☆

یوں لگ چکی ہے لوگوں کے منہ جھوٹ کی مٹھاس

سچائیوں کا گھونٹ کسی سے پیا نہ جائے

محسنؔ مری زبان قلم ہو تو ہو مگر

قاتل کو مجھ سے عیسیٰ دوراں کہا نہ جائے

محسنؔ زیدی کے مزاج و کردار کے عکاس ہیں یہ اشعار ؎

کمینوں کی ذلالت پر رہے چپ
بزرگوں کی شرافت سامنے تھی

☆☆☆

طے ہم نے بھی کر رکھا ہے مانگیں گے نہ اس سے
یہ سچ ہے اگر قبلۂ حاجات وہی ہے

☆☆☆

عزت کی بھیک اُس درِ ذلّت سے مانگنے
میرا تو کیا سوال ہے میری بلا نہ جائے

☆☆☆

وہ بھی پھرتے ہیں لئے کاسۂ جاں

خود سوالی ہیں تو کیا دیں گے مجھے

☆☆☆

دشمن کو بھی ہم نے کبھی دشمن نہیں سمجھا

ہم جاں سے گئے اپنی وسیع النظری میں

ان کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہوئی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

وہ کہہ رہے ہیں آؤ تو پندار رکھ کے آؤ
سر پر کوئی کلاہ نہ دستار رکھ کے آؤ

اس دھوپ میں سفر کا اگر قصد ہے تو پھر
گھر پر خیالِ سایۂ دیوار رکھ کے آؤ

بزمِ منافقاں ہے یہ آؤ جو تم یہاں
زیرِ نقاب چہرۂ تہہ دار رکھ کے آؤ

مصلوب ہونا اتنی بڑی بات تو نہیں
پہچان اپنی کوئی سرِ دار رکھ کے آؤ

☆☆☆

کبھی کبھی گرمیٔ جذبات کی بات بھی کر لیتے ہیں:

ہے کتنا مشابہ تری تصویر سے کوئی
صورت وہی جامہ وہی ہر بات وہی ہے

کچھ میرے ہی مانند ہے طرزِ سخن اس کا

انداز و اشارات و کنایات وہی ہے

دونوں ہی طرف آگ برابر کی ہے محسنؔ

دونوں ہی طرف گرمی جذبات وہی ہے

☆☆☆

یک قطبی حکمرانی کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

وہ بھاؤ بدل سکتا ہے بس ایک نظر سے

ساری ہی دکانیں سبھی بازار ہیں اس کے

کچھ لوگ ہیں ایسے بھی جو حق بات کہیں گے

ایسا تو نہیں سب ہی نمک خوار ہیں اس کے

محسنؔ جو ملے جنسِ ہنر ہم کو بتاؤ

کوئی نہ سہی ہم تو خریدار ہیں اس کے

محسنؔ زیدی نے جدید دہلی کی ہنگامہ آرائیوں میں اپنے خاصے دن گزارے۔ وہاں کی علمی ادبی محفلوں، احباب اور اغیار کی صحبتوں میں طرح طرح کے تجربوں اور مشاہدوں سے گزرے اور بیش تر وقت روشن خیالوں اور خوش خصالوں میں گزارا۔ مگر لکھنؤ آباد کرنے کے بعد ان کو میر صاحب یاد آئے۔

میر تو تاجورِ ملکِ سخن تھے محسنؔ

لکھنؤ آ کے نہ کچھ میرؔ کی توقیر بڑھی

دہلی سے لکھنؤ کی ہجرت کا مسئلہ میرؔ صاحب کا روزی روٹی کا مسئلہ تھا۔ محسنؔ صاحب کا یہ مسئلہ ہرگز نہ تھا انھوں نے بعض دوسرے اسباب کی بنا پر دہلی کو چھوڑ کر لکھنؤ آباد کیا چنانچہ جب موصوف دہلی سے چلے تو یہ کہتے ہوئے چلے۔

دلّی سے جا رہا ہوں محسنؔ مگر نہ پوچھو

کیا کچھ یہاں سے لے کر کیا کچھ یہاں گنوا کر

اور جب یہاں آ کر بس گئے تو ماحول و معاشرت نے یہ کہنے پر مجبور کر دیا۔

خیر باد آپ نے دلّی کو کہا کیوں محسنؔ

اس خرابے میں ہوا آن کے بسنا کیسے

درجِ ذیل متفرق اشعار اور غزلوں میں محسنؔ زیدی کے بیان کردہ ذاتی اور غیر ذاتی جذبات سے سماجی حقائق پر روشنی پڑتی ہے اور ان کی شخصیت میں خودداری اور خود اعتمادی کے عناصر جو ان کے مزاج کا حصہ ہیں فن کو جلا بخشنے میں مدد کرتے ہیں، ان کے تمامتر کلام سے عصری تقاضوں کو تقویت ملتی ہے اور اس طرح محسنؔ زیدی ہمارے سماجی شعور کے ارتقاء میں مہذب طریقے سے آزاد نمائندگی کرتے ہیں اور یہی بات ان کو دوسرے ہمعصر شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔

جتنی ہی تیز جھوٹ کے ہونٹوں پہ تھی مٹھاس

اتنا ہی تلخ زہر بھی سچائیوں میں تھا

اس دشت میں تھا اندھا کنواں ہی مرا نصیب

کچھ فرق دشمنوں نہ سگے بھائیوں میں تھا

☆☆☆

ایسا نہیں کہ اور ستمگر نہ آئیں گے

لیکن تمہارے قد کے برابر نہ آئیں گے

اس بار کھو دیا تو ملیں گے نہ پھر تمہیں

اب کے جو ہم گئے تو پلٹ کر نہ آئیں گے

مل جل کے آؤ بخش دیں ان لمحوں کو دوام

یہ لمحے زندگی میں مکرّر نہ آئیں گے

☆☆☆

مرے قلم نے نہ باطل کا تذکرہ لکھا

مآل کچھ بھی ہوا حرفِ حق سدا لکھا

وہ اک فریب تھا سجدہ جسے کہا اس نے

وہ ایک عرضِ غرض تھی جسے دعا لکھا

عجب ہے اس کی سیاست لکھا جبیں پہ کبھی

کبھی مٹا کے وہی نام زیر پا لکھا

وہ حرف حرف تو محسنؔ ہے میری ہی تحریر

مٹاؤں کیسے خود اپنے ہی ہاتھ کا لکھا

☆☆☆
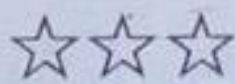
کوئی بتاؤ کہاں جا کے اب وہ پیاس بجھائیں

سمندروں سے بھی ہو کر جو تشنہ لب گزرے

ترا ستم تو زمانہ پہ آشکارا تھا

ترے کرم پہ مگر شک عجب عجب گزرے

☆☆☆

امیر شہر سے رشتوں کو استوار کرو

کہ راہ اک یہی دربار تک رسائی کی ہے

☆☆☆

سبھی ہیں چہروں پہ چہرے یہاں لگائے ہوئے

بڑے فروغ پہ اب رسمِ رُو نمائی ہے

محسنؔ صاحب لاکھ غمِ دوراں کی بات کریں مگر کبھی کبھی تو کوئے ملامت کی سیر کرنے کا ان کا بھی جی چاہتا ہے فرماتے ہیں:

بس کہ دشوار ہے اس شخص کا چہرا لکھنا

ورنہ مشکل تو نہیں کوئی سراپا لکھنا

پاسِ تہذیب تو کچھ پاسِ قلم ہے ہم کو

ورنہ آتا ہے ہمیں جیسے کو تیسا لکھنا

سر میں سودا تھا عجب لکھ گیا اس کو کیا کچھ

دل نے سمجھایا بہت تھا کہ نہ ایسا لکھنا

لکھتے ہی جائیں گے ہم ان کو عریضے محسنؔ

وہ پڑھیں یا نہ پڑھیں کام ہے اپنا لکھنا

☆☆☆

میں پاس رہ کے بھی تیرے قریب آ نہ سکا
مری پہونچ کو نہیں میری نارسائی دیکھ

نظر میں چڑھ کے بھی دنیا کی گر گیا کہ نہیں
کہا تھا تجھ سے نہ کر اتنی خودستائی دیکھ

یہاں جو رہنا ہے محسنؔ تو اس سے بُعد نہ رکھ
امیرِ شہر سے اس کی ہے آشنائی دیکھ

☆☆☆

ہونا ہے ہم سبھی کو جو مغلوب ایک دن
پھر کیوں چلیں نہ مل کے سردار سب کے سب

شاخِ نہالِ غم کی ہے شانِ نمو الگ
ہوتے کہاں ہیں نخلِ ثمر بار سب کے سب

خبریں پرانی ہو گئیں دو ایک دن کے بعد
ردّی کے بھاؤ بک گئے اخبار سب کے سب

☆☆☆

کہاں وہ پاسِ مراسم، وہ دوستی کا خیال

کہ اب رہا نہ کسی کو یہاں کسی کا خیال

کچھ ایسا بیٹھ گیا دل میں تیرگی کا خیال

کہ ڈر گیا ہوں جو گزرا بھی روشنی کا خیال

☆☆☆

کسی سے کیا کہا جائے کس سے کیا سنا جائے

دل تو رنگِ محفل کو دیکھ کر بجھا جائے

بزمِ کیف و مستی بھی بن گئی عزا خانہ

اب غزل کا لکھنا کیا مرثیہ لکھا جائے

کس طرح یہ ممکن ہے گردوپیش سے محسنؔ

آنکھ پھیر لی جائے منہ چھپا لیا جائے

☆☆☆

ہر شخص یہاں گنبدِ بے در کی طرح ہے
آواز پہ آواز دو سنتا نہیں کوئی

اس خاک سے اُٹھا ہے ہمارا خمیر بھی
تم ہو اگر یہاں کے تو ہم بھی یہاں کے ہیں

سچ بول کر زبان قلم بھی ہوئی تو کیا
چرچے تو ہر زبان پہ میری زباں کے ہیں

☆☆☆

یہ روز و شب کا سلسلہ تبدیل کچھ تو ہو
روشن ہوں آسماں پہ کوئی مہر و ماہ اور

واضح ہے تیرگی ہی نہ واضح ہے روشنی
اس شہر کا ہو جیسے سپید و سیاہ اور

بربادیوں کا صرف تمہیں سے گلا نہیں
ہیں کچھ شریک حال مرے خیر خواہ اور

محسنؔ کسی کی جان سلامت نہیں یہاں
اب جا کے ڈھونڈیئے کہیں جائے پناہ اور

☆☆☆

بتوں کا تذکرہ لگتا ہے اچھا جس قدر اتنا

زبانِ کفر سے ذکرِ خدا اچھا نہیں لگتا

ہمیں یہ بند کمروں کا مکاں کچھ بھا گیا اتنا

کہ ہم کو اب کوئی آنگن کھلا اچھا نہیں لگتا

کٹھن رستوں پہ چلنا اپنی افتادِ طبیعت ہے

ہمیں آسان کوئی راستہ اچھا نہیں لگتا

لہو کا رنگ کچھ اتنا پسند آیا کہ اب ان کو

لہو کے سامنے رنگِ حنا اچھا نہیں لگتا

☆☆☆

سرِ موج آب کہیں کہیں

ملے کچھ حباب کہیں کہیں

وہ نظر گئی جو اِدھر اُدھر

کھلا دل کا باب کہیں کہیں

تھے جو نقش کتبۂ خاک پر

ملے زیرِ آب کہیں کہیں

گیا رائگاں تو نہ خونِ دل

کِھلے کچھ گلاب کہیں کہیں

یہ زمیں کہیں پہ جو خشک ہے

تو ہے آب آب کہیں کہیں

کہاں محسنؔ اس کو میں ڈھونڈھتا

وہ تھا خواب خواب کہیں کہیں

☆☆☆

وہی پیروں میں زنجیرِ گراں ہے کیوں نہیں کہتے

وہی دیوارِ زنداں درمیاں ہے کیوں نہیں کہتے

چراغوں کے تو جلنے کا دھواں ہے کیوں نہیں کہتے

چراغوں کے یہ بجھنے کا دھواں ہے کیوں نہیں کہتے

سبب ان دوریوں کا کیا ہے واضح کیوں نہیں کرتے

اگر دیوار کوئی درمیاں ہے کیوں نہیں کہتے

یہیں تو آتش و ناسخ سے رہتے تھے جنوں پیشہ

یہی وہ شہرِ آشفتہ سراں ہے کیوں نہیں کہتے

تمہارے لب پہ اب یہ کیوں ہے مہرِ خامشی محسن

وہ کیا مجبوریٔ لفظ و بیاں ہے کیوں نہیں کہتے

☆☆☆

موجِ گل موجِ صبا سب خاموش

تیغِ گل چیں کے سوا سب خاموش

رو بہ رو اس کے سبھی مہر بہ لب

کوئی شکوہ نہ گلا سب خاموش

سر قلم ہو گئے کتنوں کے مگر

جیسے کچھ بھی نہ ہوا سب خاموش

سب کو انجان سفر کا دھڑکا

راہ رَو، راہ نما سب خاموش

اِک تحیّر کا ہے عالم ہر سو

دور تک ارض و سما سب خاموش

سب ہوئے دُودِ چراغِ محفل

بجھ گیا سب کا دیا سب خاموش

غم گساروں کو ہوا کیا محسنؔ

کچھ دوا ہے نہ دعا سب خاموش

آخر میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اُردو زبان اور شعر و ادب کے وجود و شکست و ریخت اور اضمحلال کے دور میں بھی محسنؔ زیدی اپنے مخصوص لب لہجے، رنگ و آہنگ اور زبان و بیان کی فصاحت کی بنا پر آج اپنی ایک الگ منفرد

پہچان بنائے ہوئے ہیں۔ ان کی بیشتر غزلیں، غزل کی تمام تر ہیئتی نزاکتوں کے ساتھ عصری آگہی کی بہترین نمائندگی کرتی ہیں۔ موصوف کے کلام کی یہی خوبیاں ان کو اپنے ہمعصر غزل گوشعراء سے ممتاز کرتی ہیں۔

☆☆☆

سپاسِ محسن

ڈاکٹر جعفر عسکری ماہلی

شرابِ فکر سے لبریز جام رکھتا تھا وہ

اسی لئے تو سخن میں مقام رکھتا تھا وہ

کبھی نہ فرق خواص و عوام رکھتا تھا وہ

کہ دل میں سب کے لئے احترام رکھتا تھا وہ

وسیع تر تھے رفاقت کے سلسلے اس کے

ہر اک سے ربط پیام و سلام رکھتا تھا وہ

وہ اُس کی فکر کی جدّت وہ جودتِ احساس

سخنوروں میں الگ اپنا نام رکھتا تھا وہ

وہ روز اپنے احبّاؔ کی خیریت لینا
عجب یہ مشغلۂ صبح وشام رکھتا تھا وہ
مجھے سنانے کی خاطر کبھی کبھی جعفرؔ
سجا کے تازہ بہ تازہ کلام رکھتا تھا وہ

☆☆☆

محسنؔ زیدی۔ ایک سچا شاعر

ڈاکٹر بشیشر پردیپؔ

محسنؔ زیدی کے اکثر اشعار دل ہی میں نہیں روح میں اُتر جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں کہیں کہیں تو عمر خیام کی رباعیوں کا تقدس جھلکتا ہے۔

اک ترے ہونے پہ موقوف ہے سب کچھ ورنہ
یہ مرا حُسنِ نظر حسنِ یقیں کچھ بھی نہیں

خواب میں دیکھے تھے خوش رنگ مناظر کیا کیا
جاگتی آنکھوں سے دیکھا تو کہیں کچھ بھی نہیں

آنکھوں میں بس گئی ہے وہ تصویر اس طرح
میری نگاہِ شوق بھی تصویر ہو نہ جائے

اس سفر میں ساتھ جب کوئی نہیں
پھر مرے ہمراہ ہوتا کون ہے

نہ جانے کب ملے کس کو رہائی
نہیں اس قید کی میعاد کوئی

وہ بستر مرگ پر تھے۔ اس دنیا سے رخصت ہونے والے تھے۔ صرف ایک دن پہلے میں اپنی اہلیہ کے ساتھ اُن سے ملنے، ان کو دیکھنے گیا۔ مجھے نہیں لگا کہ وہ اتنی جلدی جانے والے ہیں۔ بلکہ مجھے اس وقت بھی امید تھی کہ شاید وہ ٹھیک ہو جائیں! نہ جانے انسان آنے والے خطرے کو دور رکھنے کی کوشش کیوں کرتا ہے؟! اس وقت انہوں نے ایک شعر کہا۔ میں ٹھیک طرح سے سُن نہ سکا۔ ان کی اہلیہ سمجھ گئیں۔ انہوں نے ایک کاغذ پر لکھ دیا۔

میں نے خود کو تو بدلنے کی بہت کوشش کی
سخت حیرت ہے بدل جاتی ہے دنیا کیسے

یعنی محسؔن زیدی اس دنیا سے رخصت ہونے تک اس دنیا کے ہیر پھیر سے واقف نہ ہو سکے۔ وہ حیرت کا اظہار کر رہے تھے کہ دنیا کے لوگ اپنا مطلب نکالنے کے لئے کیسے بدل جاتے ہیں۔ وہ خود زمانے کے مطابق نہ بدل سکے۔ جس راستے کو انہوں نے صحیح سمجھا اسی پر چلتے رہے۔ جو اصول انہوں نے اپنائے انہیں پر قائم رہے۔ محسؔن زیدی یقیناً ایک با اصول انسان تھے۔ ایک سچے شاعر تھے۔

محسنؔ زیدی سے ایک انٹرویو

مہ جبیں صاحبہ

س۔ محسنؔ صاحب ہم اپنے اسٹوڈیو میں آپ کا استقبال کرتے ہیں۔

ج۔ شکریہ!

س۔ ایک سوال جو آپ کے لئے غیر متوقع بھی ہوگا، اسے ہم کر رہے ہیں۔ بہ یک وقت آپ شاعر بھی ہیں اور ماہرِ معاشیات بھی، عام طور پر ایک شاعر معاشی طور پر بہت مظلوم اور مسکین ہوتا ہے۔ ان دونوں متضاد چیز۔

ج۔ میں اپنے کو ماہر معاشیات تو نہیں کہوں گا ہاں میں ایک معاشیات کا طالبعلم تھا اور معاشیات میں کچھ ایسے موضوعات ہیں جس کا میری شاعری پر کافی گہرا اثر ہے۔ میرے چاروں مجموعوں میں اگر آپ تلاش کریں تو بے انتہا اشعار آپ کو اس موضوع پر ملیں گے۔ مثلاً معاشی نابرابری اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم۔ اس ذیل میں آپ کو چند اشعار پیش کروں گا۔

س۔ یعنی آپ کی شاعری پر معاشیات نے اثر ڈالا۔

ج۔ جی ہاں معاشیات نے اثر ڈالا اور میں نے اس سے استفادہ کیا۔ یہ معاشی نابرابری کے سلسلہ سے شعر پیش کر رہا ہوں:

تھا شاہراہ پر تو اجالا ہر ایک سو

لیکن گلی میں اپنی اندھیرا رہا تمام

دوسرا شعر ہے:

اپنے دیار ہی میں رہا قحطِ آب کیوں

کیا ابر ایک سمت برستا رہا تمام

ایک اور شعر ہے:

یہ بات دیکھنے کی نہیں سوچنے کی ہے

افلاس ہے زیادہ کہ دولت زیادہ ہے

دوسرا موضوع جو ہے معاشیات کا وہ بھی بہت اہم ہے، وہ بھی ملٹی نیشنل کمپنیاں اور ڈولپڈ کنٹریز یعنی غیر ملکی کمپنیوں اور ترقی یافتہ ممالک کی معاشی بالادستی ہے۔ اس ذیل میں ایک شعر ملاحظہ فرمائیں:

وہ بھاؤ بدل سکتا ہے بس ایک نظر سے

ساری ہی دوکانیں سبھی بازار ہیں اُس کے

ساری دنیا کی منڈی پر حاوی ہیں یہ ممالک، اور یہ غیر ملکی ملٹی نیشنل کمپنی حاوی ہیں۔ ایک اور اہم موضوع ہے معاشیات کا Urbanaisation یعنی گاؤں سے شہر کی طرف ہجرت اور Deforestation جنگلوں کا کاٹا جانا اس سلسلہ سے ایک شعر ملاحظہ فرمائیں۔ پہلے تو Urbanaisation کا کیا حال ہے کہ لوگ بھٹک رہے ہیں۔ شہروں میں جگہ نہیں ہے رہنے کی اور پُر فضا جگہوں کو گاؤں میں چھوڑ کر چلے آئے ہیں۔

محسنؔ مرے لئے کہیں جائے اماں نہ تھی

مَیں اک غریبِ شہر بھٹکتا رہا تمام

اشجار کاٹے گئے ہیں اس کے متعلق میرا شعر ہے:

اب چھاؤں کے لئے کوئی دیوار ڈھونڈیے

اس شہر میں تو کٹ گئے اشجار سب کے سب

اور آخر میں معاشیات کا کس طرح مری شاعری پر اثر رہا اس کے لئے عرض کروں، غزل کی جو صنف میں نے اختیار کی تو اکنامکس کا پہلا اصول ہے کہ خرچ کم ہو اور Output زیادہ ہو تو غزل میں کم سے کم الفاظ میں اظہارِ خیال کی خاطر میں نے معاشیات کے اصول کے زیرِ اثر غزل کی صنف کا انتخاب کیا۔

س۔ واقعی یہ انوکھا امتزاج ہے معاشیات اور شاعری کا۔ ایک بات اور نہیں سمجھ میں آتی ہے کہ آپ کا تعلق ہے بہرائچ ضلع سے اور تعلیم حاصل کی آپ نے الٰہ آباد یونیورسٹی میں اور اعلیٰ تعلیم حاصل کی لکھنؤ یونیورسٹی سے یعنی ایم.اے. کیا اور اب رہائش اختیار کی ہے لکھنؤ میں۔

ج۔ بنیادی طور پر میں اودھ کا رہنے والا ہوں اور بہرائچ بھی اودھ کا ایک اہم شہر ہے اور وہاں کی ایک تحصیل ہے نانپارہ، اس کا بہت تعلق لکھنؤ سے رہا۔ لکھنؤ کے اکثر رئیس نانپارہ منتقل ہوتے رہے۔ یگانہ چنگیزی کا ایک مصرعہ یاد آرہا ہے جو انھوں نے پیارے صاحب رشید کے بارے میں کہا تھا کہ:

"پیارے صاحب بھی چلے نانپارے صاحب"۔

آثر لکھنوی صاحب کا تعلق بھی نانپارے سے تھا۔ وہاں کا رہن سہن، وہاں کا

کھانا وغیرہ، لکھنؤ سے زیادہ قربت رہی لکھنؤ میں مَیں نے تعلیم حاصل کی اور پھر دلّی ملازمت کے سلسلہ سے چلا گیا تو یہ پھر Home Coming ہی سمجھئے۔ میں اپنے وطن واپس آ گیا۔ بہرائچ اور لکھنؤ گھر آنگن کی بات ہے تین گھنٹہ کا سفر ہے اور دلّی بہرائچ کے درمیان لکھنؤ سے گذرنا ناگزیر ہے۔

س۔ ایک بات اور جاننا چاہوں گی۔ شاعری آپ نے کس عمر سے شروع کی اور کن شعراء نے لاشعوری طور پر آپ کی شاعری پر اپنا اثر ڈالا؟

ج۔ شاعری تو میں نے بہت کم عمری میں شروع کی۔ ۵۰ء کی بات ہے۔ نصف صدی ہو گئی ہے۔ اس زمانہ میں پرتاپ گڈھ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اور وہاں کے ادبی منظرنامہ میں نازش پرتاپ گڈھی ادب میں نمایاں شخصیت کے طور پر ابھر کر آ گئے تھے ان سے بڑا متاثر رہا۔ نوجوان شاعر تھے اور ترقی پسند تھے لب ولہجہ بھی نیا تھا ان سے کافی متاثر ہوا۔

س۔ استاد شعراء؟

ج۔ استاد تو مجھے مل نہیں سکا اس لئے کہ۔۔۔۔۔۔۔

س۔ نہیں استاد سے میرا مطلب ہے کہ استاد شعراء سے استفادہ۔۔۔۔۔۔۔

ج۔ میں نے تمام کلاسیکل شعراء کا مطالعہ کیا ہے۔ میرؔ ہیں، مومنؔ ہیں۔ غالبؔ ہیں، ناسخؔ ہیں، میر درد ہیں، آتشؔ ہیں، انیسؔ ہیں۔ ان سب کے کلام سے استفادہ کیا۔

س۔ لیکن ان سے اثر نہیں قبول کیا؟

ج۔ نہیں ان کا اثر رہا۔ الفاظ کے دروبست میں اور ایک کلاسیکل رچاؤ ہے جسے حاصل کرنے کی کوشش کی وہ انھیں لوگوں سے حاصل کیا۔

س۔ اب آپ کیا سوچتے ہیں قاری کی طرف سے یا سامع کی طرف سے جو پذیرائی آپ کو ملنی چاہئے تھی وہ ملی کہ نہیں؟ آپ مطمئن ہیں؟

ج۔ میں اپنے طور پر مطمئن ہوں جن لوگوں سے مجھے Feed back ملا انھیں میری شاعری پسند ہے۔ اب یہ کہ مجھے وہ آرٹ نہیں آتا Self publicity جسے کہتے ہیں وہ میں نے سیکھا ہی نہیں۔

س۔ لیکن خوشبو تو اپنے آپ متوجہ کر لیتی ہے۔

ج۔ چکبست کا ایک شعر مجھے یاد آرہا ہے۔

چمن زارِ محبت میں اسی نے باغبانی کی

کہ جس نے اپنی محنت کو ہی محنت کا ثمر جانا

میں تو شعر کہہ رہا ہوں محنت کر رہا ہوں۔ اچھے شعر کہنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اب کتنی پذیرائی ہوئی اور کس قدر پذیرائی ہوئی یا نہیں ہوئی میں نے سمجھنے یا جاننے کی فکر نہیں کی۔

س۔ آپ مختلف سرکاری عہدوں پر مامور رہے اور بہت ذمہ داری کی جگہیں تھیں تو اب ملازمت کے تقاضوں اور شاعری کے تقاضے اور گھر کی ذمہ داریاں، ان سب میں توازن آپ نے کیسے پیدا کیا؟

ج۔ یوں سمجھئے۔ اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔

س۔ تو ڈوب کر نکل گئے آپ؟

ج۔ ہاں بہت مشکل تھا۔ سرکاری کام سے جو وقت بچا وہ شعر و ادب کی نذر ہو گیا۔

س۔ اور جو آپ کی گھریلو ذمہ داریاں تھیں۔۔۔۔۔؟

ج۔ گھریلو ذمہ داریوں میں مَیں مانیٹر ہی کرتا رہا کہ بچے کیا کر رہے ہیں لیکن جتنا مجھے envolve ہونا چاہئے تھا وہ نہ ہو سکا۔ یہ تو بچوں کی اپنی محنت اور سعادتمندی ہے کہ وہ کچھ نمایاں۔۔۔۔۔۔۔۔۔

س۔ یعنی جتنی توجہ آپ کو دینا چاہئے تھی وہ نہ دے سکے۔اب میں یہ جاننا چاہوں گی کہ آپ نے بیرونی ممالک کا بھی سفر کیا ہے تو کن کن ممالک کا سفر کیا ہے؟ پہلے تو آپ یہ بتائیں اس کے بعد یہ جاننا چاہوں گی کہ وہاں جا کر کس بات کو دیکھ کر آپ کو ایسا لگا کہ کاش یہ ہمارے ملک میں بھی ہوتی۔

ج۔ میں نے جن ممالک کا سفر کیا ہے اس میں جاپان، سنگاپور، تائیوان، ہانگ کانگ، انڈونیشیا، ملیشیا، تھائی لینڈ اور الجیریا شامل ہیں۔ان میں سے کچھ ممالک تو ہمارے ایک صوبہ کے برابر ہیں۔لیکن وہاں کا جو میں نے نظم ونسق دیکھا اور معاشی ترقی دیکھی اس سے بہت متاثر ہوا۔تو میں یہی سوچتا رہا کہ ہمارے ملک نے اتنی ترقی کیوں نہیں کی۔

س۔ آپ کے کون کون سے شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں اور کون سے۔۔۔۔۔

ج۔ میرے چار مجموعے آچکے ہیں۔ جس میں ''شہر دل'' ۱۹۶۱ء میں، ''رشتۂ کلام'' ۱۹۷۸ء میں، ''متاعِ آخر شب'' ۱۹۹۰ء میں اور ''بابِ سخن'' دس سال بعد ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئے۔ باقی اگر زندگی نے وفا کی اور میں یوں ہی شعر کہتا رہا تو دو چار سال بعد پانچواں بھی منظرِ عام پر لاؤں گا۔

س۔ اب تو میرا خیال ہے کہ آپ سبکدوش ہو چکے ہیں اور کافی وقت ہے آپ کے پاس اس کام کے لئے۔

ج۔ مجھے پہلے احساس تھا کہ سبکدوش ہونے کے بعد وقت ہی وقت رہے گا لیکن ایسا ہے نہیں۔ زندگی کی جو دوڑ بھاگ ہے اس سے مفر نہیں ہے۔

س۔ محسنؔ صاحب۔ جو بھی شاعر، شاعری کرتے ہیں وہ چاہتے کہ ان کو سننے والے بھی ہوں سمجھنے والے بھی ہوں تو اس سلسلہ سے پوچھنا چاہوں گی کہ اردو زبان کی جو صورتِ حال ہے اس سے متعلق آپ، جو اردو کے لئے اس وقت کام کر رہے ہیں اس سے آپ کیا امید کرتے ہیں کہ وہ اطمینان بخش ہیں؟

ج۔ اردو ایک زبان ہی نہیں ایک تہذیب بھی ہے اور اردو کی جو صورتِ حال اس وقت ہے اس سے مطمئن نہیں ہوں۔ لوگ دوسروں پر الزام رکھتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں

کررہے ہیں۔لیکن ہم خوداردو کے قاتل ہیں۔ہمیں یہ سوچنا ہے کہ ہم نے اردو کے لئے کیا کیا۔ہم نے آنے والی نسل کو کیا راغب کیا، اردو پڑھنے کی طرف؟ اردو ایک اضافی حیثیت سے بھی پڑھی جاسکتی ہے۔آپ ایم.اے. کسی سبجیکٹ میں کریں۔ اسپشلائیزیشن کسی سبجیکٹ میں کریں۔ بنگالی زبان زندہ رہی۔ بنگالی آبادی جو ہے اس نے کسی سے کوئی سہارا نہیں مانگا بنگالی کے لئے۔اسے اپنی بنگالی زبان سے جو محبت رہی ہے جو دلچسپی رہی ہے اس سے اس کی اشاعت اس کے فروغ کے سلسلہ سے برابر کوشاں رہے اور اب نہ جانے ہم اردو والوں کو کیا ہوگیا ہے کہ چاہتے ہیں کہ ہر چیز ہمیں طشتری میں رکھ کر دی جائے اور ہم کچھ نہ کریں۔

س۔ میرا خیال ہے کہ بیشتر لوگ ایسے ہوتے تھے کہ جو اردو کو مضمون کی حیثیت سے نہیں پڑھتے تھے پہلے، لیکن باوجود اس کے ان کی زبان بھی اچھی ہوتی تھی اور ان کی معلومات میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔میرے خیال میں آپ نے بھی غالباً اردو کو بحیثیت مضمون نہیں پڑھا ہے۔

ج۔ اُردو کو میں نے بحیثیت مضمون ہائی اسکول تک پڑھا ہے اور باقی جتنا بھی حاصل ہوا جتنا کچھ لکھا ہے میری اپنی کوشش ہے۔اور میں کہہ چکا ہوں کہ اردو ایک تہذیب بھی ہے ایک زبان بھی ہے۔تو اُردو تہذیب کا جن گھرانوں جن خاندانوں

سے تعلق رہا وہاں بچّے از خود اردو بولنے لگے لکھنے لگے۔ وہ تہذیب دھیرے دھیرے ختم ہوگئی ہے لوگ دوسری طرف متوجہ ہوئے۔ یہ سمجھنے لگے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم ہی کافی ہے۔ تہذیب کوئی چیز نہیں ہے۔

س۔ تو آپ کی شاعری کے لئے جو محرّک ہوئی وہ کیا چیز تھی؟

ج۔ یہ وہ ماحول تھا میرے زمانے میں۔ پرتاپ گڈھ میں نوجوان شاعر نازش پرتاپ گڈھی تھے، شاعری میں اور ہم لوگوں کے لئے گویا کہ ایک ہیرو بن گئے تھے۔ نوجوان جو اسکولوں میں پڑھ رہے تھے۔ بہت سے شعرا ہم عمر تھے ہمارے اس زمانہ میں۔ رسالے بہت آتے تھے ہم لوگ رسالے پڑھتے تھے۔ یہاں تک کہ قلمی رسالے ہم لوگ نکالتے تھے ہاتھ سے لکھ کر، یہ وہ دور تھا، اور اب یہ کہ اب رسالے بند ہورہے ہیں اخبارات بند ہورہے ہیں۔ پڑھنے والے ختم ہورہے ہیں۔ یہ میں ضرور عرض کروں گا کہ بڑے شہروں کے مقابلہ میں چھوٹی بستیوں میں آج بھی اردو زندہ ہے اور آگے بڑھ رہی ہے مدرسے جو ہیں انھوں نے بھی ایک رول ادا کیا ہے۔ ان کی وجہ سے آج جو بھی جہاں بھی ہے اردو ان کی دین ہے۔

س۔ محسؔن صاحب، چلتے چلتے ہمارے سامعین کو اپنے کلام سے نوازیں وہ ضرور منتظر ہوں گے۔

ج۔ لیجئے۔ایک غزل کے چند شعر پیش کر رہا ہوں،تازہ ترین غزل ہے۔

کچھ نہ اچھا نہ کچھ خراب لگا

مجھ کو سب کچھ بس ایک خواب لگا

اس نے کھولے جو لب تو اس کا سخن

پنکھڑی پنکھڑی گلاب لگا

اس کی نظروں کے صرف تیر نہ گن

میرے زخموں کا بھی حساب لگا

جستہ جستہ مطالعہ جو کیا

وہ ورق در ورق کتاب لگا

اُس کی باتوں میں وزن تھا لیکن

اُس کا لہجہ بہت خراب لگا

(بہ شکریہ،آلِ انڈیا ریڈیو اردو پروگرام جون ۲۰۰۳ء)

غزلیاتِ مُحسن

(شاعر کے قلم سے)

جنبشِ نوکِ قلم ہی مسیحی خنجر کے خلاف
کوئی میدان میں آئے تو ستم گر کے خلاف

کبھی آواز تمہارے کبھی دہن سے نکلے
کوئی روزن تو کھلے گنبدِ بے در کے خلاف

آج کیا بارہا تاریخ میں ایسا ہی ہوا
راہرو ہو گئے خود اپنے ہی رہبر کے خلاف

اب بھی اک سلسلۂ جبر ہے جاری کہ جو تھا
اب بھی پرواز معین شاہیں کی کبوتر کے خلاف

وہ جو لکھا تھا وہی سامنے آیا ہر بار
جنگ کرتے رہے ہم پھر بھی مقدر کے خلاف

دستِ گلچیں کو قلم کر دیا ہم نے اب کے
تاکہ اب سے نہ اٹھے ہاتھ گلِ تر کے خلاف

سارا ہی شہر تھا جب خون کا پیاسا محسن
تیغ اٹھاتے بھی تو کس کس کے تن و سر کے خلاف

○

☆

ارمان اس سے اور زیادا نہیں مجھے
اس کے سوا کسی کی تمنا نہیں مجھے

غائب ہوا تمام ہی چہروں سے آب و رنگ
چہرہ نظر میں اب کوئی جچتا نہیں مجھے

میں خود سے آ گیا ہوں تمہاری گرفت میں
اب مجھ کو پا گئے ہو تو کھونا نہیں مجھے

آنکھوں سے اپنی دیکھ لیا اتنا کچھ کہ بس
مطلوب اور سیر و تماشا نہیں مجھے

اک قرض آخری تو چکانے کی بات ہے
اس شہر میں اب اور ٹھہرنا نہیں مجھے

جا کر اسے تلاش کروں کس پتے پہ میں
اپنا پتا جب اس نے بتایا نہیں مجھے

کہتے ہیں آپ آتا نہیں گفتگو کا فن
سچ یہ ہے جھوٹ بولنا آتا نہیں مجھے

پہچانتا وہ کیسے مجھے ایسی بھیڑ میں
اس نے کبھی الگ سے تو دیکھا نہیں مجھے

آنگن ہی اپنا خاک اُڑانے کو ہے بہت
درکار کوئی دامنِ صحرا نہیں مجھے

محسوس یہ ہوا کوئی جیسے ہو سامنے
دیکھا تو کوئی بھی نظر آیا نہیں مجھے

محسنؔ میں اپنی دھن میں تھا، بڑھتا چلا گیا
اس نے بھی آ کے سامنے روکا نہیں مجھے

☆

پائے نگاہِ شوق کو زنجیر بھیج دو
اپنی کوئی پرانی ہی تصویر بھیج دو

اس کو ہی اپنے خط کا سمجھ لوں گا میں جواب
واپس مجھے ہی تم مری تحریر بھیج دو

شرح جفا کے ساتھ اگر تم سے بن پڑے
لکھ کر مری وفا کی بھی تفسیر بھیج دو

منہ سے تمہیں بتانے میں ہے کچھ حجاب اگر
خط ہی میں رکھ کے خواب کی تعبیر بھیج دو

یارو نشانہ اور کسی کو بناؤ کیوں
میری ہی سمت طنز کے سب تیر بھیج دو

بے تیغ ہی لڑوں گا اگر پھر پڑے گا رن
دشمن کو چاہیے تو یہ شمشیر بھیج دو

محسنؔ کرو یہ حرف و حکایت اسی پہ ختم
اس کو ہی اپنی آخری تحریر بھیج دو

جب دل کسی کی زلفِ گرہ گیر میں نہ تھا
آزاد تھا بندھا ہوا زنجیر میں نہ تھا

اک بار مجھ سے مل کے نہ وہ پھر کبھی ملا
دو چار دن کا ساتھ بھی تقدیر میں نہ تھا

تم نے ہی اس کو حرفِ غلط جان کر پڑھا
ورنہ غلط تو کچھ مری تحریر میں نہ تھا

گلنار کر گئی مجھے میرے لہو کی آگ
یہ رنگ تو کبھی مری تصویر میں نہ تھا

اس بار کوئی سینہ سپر کیوں نہیں ہوا
اب کے تو دم بھی سینۂ شمشیر میں نہ تھا

ظاہر میں کچھ ہے اور تو ہے زائچے میں اور
ایسا لکھا ہوا مری تقدیر میں نہ تھا

دیکھا تھا خود کو عکس کی صورت بس ایک بار
پھر میں کسی بھی پیکر و تصویر میں نہ تھا

محسنؔ اُسے بھی میری نگاہوں نے پڑھ لیا
وہ بات جس کا ذکر بھی تحریر میں نہ تھا

کہاں کا ایسا وہ یکتائے روزگار میں تھا
نہ ہوتا شہ کا مصاحب تو کس شمار میں تھا

میں اس دیار کو کیوں چھوڑ کر کہیں جاتا
مرا تو جو بھی تھا سب کچھ اسی دیار میں تھا

تمہیں بتاؤں میں کس طرح دل کو سمجھاتا
قرار دل کا کوئی میرے اختیار میں تھا

کھِلا ہوا تھا گلِ نو بہار کی صورت
اگرچہ عمر کی وہ آخری بہار میں تھا

تلاش میں تھے عبث میرے ہم صفیر کہ میں
یہاں وہاں نہ کسی گوشہ و کنار میں تھا

تھا اب کے فصلِ جنوں میں عجیب سناٹا
فرازِ دار پہ کوئی نہ کوئے یار میں تھا

غلط نہ تھا کوئی طولِ کلام بھی محسنؔ
مگر کلام کا تو حسن اختصار میں تھا

☆

نہ یاد کر کے وہ روئے نہ اب رلائے مجھے
میں اس کو بھول گیا وہ بھی بھول جائے مجھے

میں اک چراغ سرِ رہ گزار ہوں جیسے
کبھی جلائے مجھے وہ کبھی بجھائے مجھے

مرا ضمیر کبھی مجھ پہ تیر برسائے
کبھی شعور مرا نیشتر لگائے مجھے

سفر میں کس کو کہاں موڑ کاٹنا ہوگا
کہاں سے کون جدا ہوگا یہ بتائے مجھے

کبھی تو کوئی شناسا یہاں نظر آئے
کوئی کبھی تو مرے نام سے بلائے مجھے

کبھی جو نام نہ لوں اس کا اور سو جاؤں
تو اس کے بعد کئی دن نہ نیند آئے مجھے

رہی نہ کوئی بھی محسنؔ نمود کی صورت
مری نگاہ تو خود مجھ سے بھی چھپائے مجھے

بچا نہ کوئی بھی سیلِ بلا کے ہوتے ہوئے
سفینہ غرق ہوا نا خدا کے ہوتے ہوئے

عبث ہے اب کوئی بادِ سموم سے شکوہ
کِھلا نہ جب کوئی غنچہ صبا کے ہوتے ہوئے

زمیں ترستی رہی بوند بوند پانی کو
کہیں بھی مینھ نہ برسا گھٹا کے ہوتے ہوئے

بڑے فروغ پہ ہے کاروبارِ کسب و ریا
تمام دعویِ صدق وصفا کے ہوتے ہوئے

کٹے گی فصل سروں کی کہ شمر ہے موجود
چھدیں گے سب کے گلے حرملہ کے ہوتے ہوئے

خدا کی بستی پہ یہ قہرِ آسماں محسنؔ
یہ ظلمِ خلقِ خدا پر خدا کے ہوتے ہوئے

پلک جھپکتے ہوا ختم روشنی کا سفر
بساطِ خاک پہ جیسے ہو چاندنی کا سفر

یہ تار تار قبا یہ لہولہان بدن
یہ خار زارِ تمنا یہ زندگی کا سفر

چلے ہیں اہل جنوں لے کے آشتی کا پیام
یہ دشمنوں کا علاقہ یہ دوستی کا سفر

چلو یہ منزل آب و سراب بھی گذری
کہ اب یہاں سے ہے دو چار گام ہی کا سفر

کہیں نہ آب نہ برگ و گیاہ دور تلک
یہ پا پیادہ سرِ دشت تشنگی کا سفر

یہاں پہنچ کے بھی محسؔن سفر نہ ختم ہوا
کہ اب یہاں سے ہے درپیش واپسی کا سفر

جادو ہوائے وقت کا آخر کار چل گیا
سب کے چراغ گل ہوئے اس کا چراغ جل گیا

سب کے لئے تھے ایک سے راہ کے پیچ و خم مگر
کوئی نہ گر کے اٹھ سکا گر کے کوئی سنبھل گیا

اس سے مرے تعلقات ویسے بھی کب تھے استوار
میں نے بھی اپنی راہ لی اس کا جو رخ بدل گیا

شیشۂ شب سے رات بھر کون ہوا لہولہان
کون نگارِ صبح کے رخ پہ گلال مل گیا

ساتھ چلے تھے سب مگر یاد کسی کو کچھ نہیں
کون کہاں ٹھہر گیا کون کدھر نکل گیا

☆

ہم تو ہر حال میں جی لیں گے ہمارا کیا ہے
تم یہ بتلاؤ کہ احوال تمہارا کیا ہے

ہم نے دیکھا ہے بدلتی ہیں نگاہیں کیسے
جانتے ہیں یہ کنایہ یہ اشارہ کیا ہے

یہ تو اس خواب کی دھندلی سی بھی تصویر نہیں
ہم یہ کیا دیکھ رہے ہیں یہ نظارا کیا ہے

ٹھن گئی موجِ تلاطم سے تو ساحل کیسا
تیرتے رہنا ہی ٹھہرا تو کنارا کیا ہے

سب کرشمہ ہے بس اِک حسنِ نظر کا ورنہ
کوئی شبنم کوئی گل کوئی ستارا کیا ہے

اپنی تقدیر میں جب لکھ گئی ہجرت محسنؔ
اب بجز خانہ بدوشی کوئی چارا کیا ہے

☆

مجھے یہ کیسی موجوں میں سمویا
یہ کس پاتال میں لاکر ڈبویا

تپایا دھوپ میں پہلے تو مجھ کو
پھر اس کے بعد بارش میں بھگویا

رہا بس انتظارِ ابر و باراں
گئے موسم میں ہم نے کچھ نہ بویا

مرا اندازِ گریہ مختلف تھا
نہ پلکوں کو نہ دامن کو بھگویا

بکھر جانا ہی جب مقسوم ٹھہرا
کسی دھاگے میں مجھ کو کیوں پرویا

طبیعت اب کہیں ہلکی ہوئی ہے
بہت دن بعد میں جی بھر کے رویا

میں تھا انجان رستوں کا مسافر
میں اک گمنام منزل کا تھا جویا

ہوا کم اعتبار اپنا جو محسنؔ
زمانے میں بھرم اُس نے بھی کھویا

خوشا اس کا گل و گلزار ہونا
مرے سپنوں کا وہ ساکار ہونا

کسی کا ڈوب جانا اُس کنارے
کسی کا منتظر اِس پار ہونا

وہ اُس کا روٹھ جانا ہر کسی سے
پھر اپنے آپ سے بیزار ہونا

زباں سے چاہتوں کے پھول جھڑنا
دلوں میں نفرتوں کے خار ہونا

مقدر میں ہے جب صحرا نوردی
تو کیا گھر کیا در و دیوار ہونا

سبک تھا مجھ کو نا ہموار رستہ
گراں ہے راہ کا ہموار ہونا

رہا محسنؔ یہی جو زورِ طوفاں
بہت مشکل ہے بیڑا پار ہونا

کہا کچھ تھا زمانے نے سنا کچھ
فسانہ کچھ تھا لیکن بن گیا کچھ

سبھی اپنے تھے کوئی غیر کب تھا
کہ اپنا تھا سبھی سے واسطہ کچھ

کوئی ترتیب کب ہے زندگی میں
کہ یکجا کچھ ہے تو بکھرا ہوا کچھ

کہیں جیسے ہوں کچھ سرگوشیاں سی
کہیں سے آئی ہو جیسے صدا کچھ

یہ رشتہ استوار اتنا نہیں ہے
کہیں سے جیسے ہو ٹوٹا ہوا کچھ

قدم سے پھر قدم کیسے ملاتے
کہ اپنا راستہ ہی تھا جدا کچھ

کھلے گی دھیرے دھیرے یہ گرہ بھی
نہیں پُر پیچ ایسا مسئلہ کچھ

ہوئی شامل جو اُس کی سُرخیِ لب
ہوا ہے جامِ مے دوآتشہ کچھ

چلے تو تھے ہَوا کے رُخ پہ لیکن
بدلتی جا رہی ہے رُخ ہوا کچھ

نکل تو آئی تھی طوفاں سے کشتی
رہا ساحل سے لیکن فاصلہ کچھ

توجہ ہم فقیروں کی طرف بھی
کوئی غمزہ کوئی ناز و ادا کچھ

مقاماتِ جنوں کیا اور بھی ہیں
ابھی کیا خاک اُڑانا رہ گیا کچھ

ملا تو کیا ملا یہ مجھ کو محسنؔ
مرے لب پر تھا حرفِ مدعا کچھ

☆

توڑنا جب چاہتے ہیں پانو کی زنجیر سب
سوچتے پھر کیوں نہیں مل کر کوئی تدبیر سب

نقش تازہ ہے نہ کوئی عکسِ نو پیشِ نظر
دیکھتے ہیں روز و شب بس ایک ہی تصویر سب

اِس قدر مصروف ہیں تیشہ زنی میں اکیلے لوگ
کاٹ کر لانے چلے ہوں گویا جوئے شیر سب

مار کر شب خون دشمن دُور جا نکلا کہیں
اور اندھیرے میں چلا کر رہ گئے ہم تیر سب

ساتھ تو مل کر چلے تھے سب مگر پھر یہ ہوا
مختلف سمتوں میں بٹ کر رہ گئے رہگیر سب

اُس ستمگر کو تو بس اک میرا ہی سر چاہیے
منحصر ہے اِک مری ہی جاں پہ دار و گیر سب

دیکھیے ہوتا ہے کیا انجام اس تعمیر کا
کر رہے ہیں ریت پر اب کے مکاں تعمیر سب

ہجر و وصلِ دوست کوئی واقعہ ایسا نہیں
اک ذرا سی بات کی کرتے ہیں کیوں تشہیر سب

دیکھیے گا محسنؔ اب کے جُنبشِ نوکِ قلم
راز کھلتے جائیں گے اب کے دمِ تحریر سب

☆

ساری بستی میں ہے دوانہ ایک
سرپھروں میں ہے بس یگانہ ایک

یہ تو دنیا ہے چپ نہیں ہوگی
روز نکلے گا شاخسانہ ایک

چاہئے کب اُسے جوازِ ستم
اُس کو تو چاہئے بہانہ ایک

جلنا بجھنا وہی چراغوں کا
رات دن ہے وہی فسانہ ایک

لُو سے ساری جھلس گئیں فصلیں
خرمنوں میں نہیں ہے دانہ ایک

ساری تیغیں ہیں اک گلو کے لئے
سارے تیروں کا ہے نشانہ ایک

جانے کب یہ نگہ بدل جائے
کبھی رہتا نہیں زمانہ ایک

رہتے تھے ہم یہیں کہیں محسنؔ
تھا یہیں اپنا آشیانہ ایک

☆

سوائے خاکِ جاں باقی بچا کیا
کسی کی اب دعا کیا بددعا کیا

نہ لائیں لب پہ ہم نامِ وفا کیا
کوئی یہ بھی ہے حرفِ ناروا کیا

یہاں سے ہو گئے رستے الگ کیوں
یہاں سے ہو رہے ہیں ہم جدا کیا

کسی کا دل اگر ٹوٹے تو ٹوٹے
کسی شیشے کا گر کر ٹوٹنا کیا

نہیں خود سے بھی جب کوئی تعلّق
تو رکھیں پھر کسی سے واسطہ کیا

یہیں پر کیا ٹھہر جائیں مسافر
یہیں پر ختم ہے یہ راستہ کیا

کہاں آ کر لٹا گھر بار اپنا
یہ بستی بھی ہے دشتِ نینوا کیا

کہو جو بھی تم اپنے منہ سے محسنؔ
جو دنیا کہہ رہی ہے وہ سنا کیا

☆

پوشیدہ جو نقاب میں چہرہ رہا تمام
اہلِ نظر میں اس کا ہی چرچا رہا تمام

تھا شاہ راہ پر تو اجالا ہر ایک سو
لیکن گلی میں اپنی اندھیرا رہا تمام

کوشش کے باوجود میں یک جا نہ ہو سکا
میرا وجود تھا کہ بکھرتا رہا تمام

اپنے لئے نہ کچھ بھی پس انداز کر سکا
غیروں کا قرض ہی میں چکاتا رہا تمام

جو سوچتا رہا نہ بیاں کر سکا ہنوز
الفاظ کا خیال پہ پہرا رہا تمام

اپنے دیار ہی میں رہا قحط آب کیوں
کیا ابر ایک سمت برستا رہا تمام

بخیہ گروں سے کارِ رفو بھی نہ ہو سکا
پیراہنِ حیات شکستہ رہا تمام

محسنؔ مرے لئے کہیں جائے اماں نہ تھی
میں اِک غریب شہر بھٹکتا رہا تمام

جن کے لبوں پہ ذکرِ محبت زیادہ ہے
اُن کے دلوں میں حد سے کدورت زیادہ ہے

حالانکہ چند گام پہ ہے یہ سفر محیط
لیکن کچھ اِس سفر میں صعوبت زیادہ ہے

سب سے ہیں اپنے ایک ہی جیسے تعلّقات
کوئی کسی سے بُعد نہ قربت زیادہ ہے

یہ بات دیکھنے کی نہیں سوچنے کی ہے
افلاس ہے زیادہ کہ دولت زیادہ ہے

اس شہرِ بے ضمیر میں بس اُس کی قدر ہے
جس کی بھی مکروفن میں مہارت زیادہ ہے

جس وقت چاہا چاک گریبان کر لیا
اہلِ جنوں کو پہلے سے فرصت زیادہ ہے

سننا بغور اب جو سناؤں گا داستاں
اس میں فسانہ کم ہے حقیقت زیادہ ہے

مجھ کو تو ہے یہی سخنِ مختصر بہت
میرے لئے یہ حرف و حکایت زیادہ ہے

یوں تو گلہ ہے کتنے ہی احباب سے مگر
کچھ خاص دوستوں سے شکایت زیادہ ہے

بہتر ہے رہنے دیجے یوں ہی پیرہن کو چاک
کارِ رفو میں ویسے بھی زحمت زیادہ ہے

محسنؔ جہاں میں جتنی بھی ہو مال و زر کی قدر
لوح و قلم کی آج بھی حرمت زیادہ ہے

میرے دامن کو بھگوتا کون ہے
میں نہیں روتا تو روتا کون ہے

راستے سے کون چن لیتا ہے پھول
راہ میں کانٹوں کو بوتا کون ہے

دیکھنا ہے زندگی کی دوڑ میں
کون یاں پاتا ہے کھوتا کون ہے

اس سفر میں ساتھ جب کوئی نہیں
پھر مرے ہمراہ ہوتا کون ہے

رات بھر ہوتے ہیں اب تو رتجگے
شہر میں راتوں کو سوتا کون ہے

ملتا ہے محسنؔ یہاں تقدیر سے
کاٹتا ہے کون بوتا کون ہے۔

حصول زر کے لئے دوڑ ہے مسلسل کیوں
تمام شہر ہوا جا رہا ہے پاگل کیوں

یہ درمیاں ہمارے خلیج کیسی ہے
کسی سے کوئی ہے کمتر کوئی ہے افضل کیوں

دکھائی پڑتی ہیں تصویریں سب ادھوری سی
حیات کا کوئی خاکہ نہیں مکمل کیوں

زمیں ترستی رہی بوند بوند پانی کو
برس گئے سرِ کہسار جا کے بادل کیوں

ہر ایک پیڑ سے لپٹے ہوئے ہیں سانپ یہاں
بنی ہوئی ہے ہر اک شاخ، شاخِ صندل کیوں

کسی کو پاس کب اِس بوریا نشیں کا تھا
بچھا رہا ہے کوئی اب یہ فرشِ مخمل کیوں

دوبارہ ویسی ہی تصویر مجھ سے کیوں نہ بنی
بنا نہ عکس کوئی مثلِ نقشِ اول کیوں

کہیں بھی کیا کوئی جائے اماں نہیں محسنؔ
ہر ایک راہ کا یہ رخ ہے سوئے مقتل کیوں

☆

ڈرتے ہیں موم کے بدن والے
ہم تو ہیں سنگِ پیرہن والے

سب ہیں ظالم کے رو بہ رو خاموش
ویسے تو ہیں سبھی دہن والے

اب کہاں کوئی کج کلاہوں میں
اب کہاں ویسے بانکپن والے

بندگانِ خدا پریشاں حال
اور مزے میں ہیں اہرمن والے

موت کا کاوربار روز یہ ہے
گور کن کچھ ہیں کچھ کفن والے

شہر میں کس کا اعتبار کریں
ہیں یہاں سب ہی مکر وفن والے

جانے کس کس کے سر اڑیں گے یہاں
یہاں آئیں تو جان و تن والے

ہو گا محسنؔ زمانہ دشمن کیوں
اہلِ ثروت ہیں ہم نہ دَھن والے

☆

خوش ہوں پوری ہوئی تمہاری مراد
میری جانب سے بھی مبارکباد

ہم بھی آ کر کہاں ہوئے آباد
جہاں آدم نہ کوئی آدم زاد

عمر بھر ہم رہے ہیں تیشہ زن
یوں ادا کی ہے سُنتِ فرہاد

کہہ دیا ہم نے جو بھی کہنا تھا
اب کریں آپ بھی تو کچھ ارشاد

کچھ دوانے یہاں بھی رہتے تھے
یہ خرابہ بھی تھا کبھی آباد

اِس سفر میں نہیں ہے کوئی ساتھ
ہم سفر ہے تو بس مرا ہمزاد

جو بھی جس پر یہاں گذر جائے
داد کوئی یہاں نہ ہے فریاد

دل کا احوال کیا کہیں محسنؔ
یہ کبھی شاد ہے کبھی ناشاد

کچھ نہ اچھا نہ کچھ خراب لگا
مجھ کو سب کچھ بس ایک خواب لگا

اُس نے کھولے جو لب تو اُس کا سخن
پنکھڑی پنکھڑی گلاب لگا

اس کی نظروں کے صرف تیر نہ گن
میرے زخموں کا بھی حساب لگا

جستہ جستہ مطالبہ جو کیا
وہ ورق در ورق کتاب لگا

اُس کی باتوں میں تھا وزن لیکن
اُس کا لہجہ بہت خراب لگا

ہم کہیں بھی نہ ہو سکے سیراب
ہر سمندر ہمیں سراب لگا

وہ کھُلے دل سے کب ملا محسنؔ
اس کے ملنے میں اجتناب لگا

کون اِس شہر میں احوال مرا جانتا ہے
مجھ پہ جو بیت رہی ہے وہ خدا جانتا ہے

وقت کے ساتھ بدل جاتی ہے دنیا کی نگاہ
وہ تو اس بات کو مجھ سے بھی سوا جانتا ہے

آ گیا کون سا یہ موڑ سفر میں کہ جسے
کوئی رہ زن نہ کوئی راہ نما جانتا ہے

مسئلہ تشنہ لبی کا ہی نہیں ہے ورنہ
وہ سرابوں میں سمندر کا پتا جانتا ہے

باریاب اُتنا ہی دربار میں وہ ہے محسنؔ
جتنا ہی جو ہنرِ مدح و ثنا جانتا ہے

جلائے ایسا کہ شعلہ بہ جاں نہ ہونے دے
وہ آگ ایسی لگائے دھواں نہ ہونے دے

اِدھر اُدھر مری تصویر وہ دکھاتا پھرے
جہاں پہ چاہوں میں ہونا، وہاں نہ ہونے دے

میں لوحِ وقت پہ جو بھی لکھوں، مٹاتا جائے
کسی بھی نقش کو وہ جاوداں نہ ہونے دے

یہ کیا کہ میں جو کہوں اس کی ہی زباں سے کہوں
مری زباں سے وہ کچھ بھی بیاں نہ ہونے دے

رہوں اسی کا رہینِ کرم کہ وہ مجھ پر
کسی کو اپنے سوا مہرباں نہ ہونے دے

چمن کو کر کے وہ پامال یوں گذر جائے
یقین کیسا کسی کو گماں نہ ہونے دے

حصار کھینچ دیا اس نے اِدر گرد ایسا
کسی کو اپنے، مرے درمیاں نہ ہونے دے

وہ رکھے سب سے ہمیشہ ہی بدگماں محسنؔ
کبھی کسی سے مجھے خوش گماں نہ ہونے دے

اُسے سنو گے جو اشعار میرے پڑھتے ہوئے
دکھائی دیں گے تمہیں منہ سے پھول جھڑتے ہوئے

پتا نہیں کہ بلندی اسے ملی کہ نہیں
نظر تو آیا تھا وہ سیڑھیوں پہ چڑھتے ہوئے

یہ کس طرح کا ہے آسیب شہر پر طاری
یہ کیسے سایے ہیں گھٹتے ہوئے نہ بڑھتے ہوئے

کسی بھی بات کو سیدھی طرح نہیں کہتے
نئے نئے ہیں اسالیب لوگ گڑھتے ہوئے

میں خوش ہوا تھا کہ لکّھا تو اُس نے خط کا جواب
اُداس ہو گیا لیکن جواب پڑھتے ہوئے

وہیں پہ ایک شجر تھا جو ایستادہ رہا
جہاں پہ دیکھے قدآور درخت اکھڑتے ہوئے

ہمیں تو آتا ہے بس ایک ہی ہنر محسنؔ
تمام عمر گذاری ہے لکھتے پڑھتے ہوئے

☆

پل بھر میں کیا یہ صورتِ حالات ہو گئی
نکلا تھا دن ابھی اور ابھی رات ہو گئی

ملنا تو کیا کہیں گے اسے یہ ضرور ہے
تکمیل راہ و رسمِ ملاقات ہو گئی

اک دن تھا طوفِ کوئے ملامت میں کٹ گیا
اک رات تھی جو نذرِ خرابات ہو گئی

پہلے تو دور دور یہ دنیا رہی مگر
دو چار موڑ کاٹ کے پھر ساتھ ہو گئی

یادش بخیر اپنا پتا پوچھ لیں گے ہم
اب کے کہیں جو خود سے ملاقات ہو گئی

وہ زندگی کہ جس کی دعا دے رہے تھے سب
میرے لئے تو مرگ مفاجات ہو گئی

اس موڑ پر تو دن کا سفر ہو گیا تمام
خیمے یہیں پہ نصب کرو رات ہو گئی

محسنؔ عدو سے جیت گئے جنگ تو مگر
خود سے مقابلہ جو ہوا مات ہو گئی

صدف ملے تو کسی کو، گہر کسی کو ملے
شجر لگائے کسی نے ثمر کسی کو ملے

مری نظر کو تو خود پر بھی شک گذرتا ہے
خدا کرے کہ نہ ایسی نظر کسی کو ملے

عجیب ڈھنگ سے تقسیم اپنے گھر کی ہوئی
کسی کو صحن تو دیوار و در کسی کو ملے

بہت دنوں سے کچھ اپنی خبر نہیں مجھ کو
کوئی بتائے جو میری خبر کسی کو ملے

کسی کو تو سرِ منزل بھی آ کے کچھ نہ ملا
گلِ مراد سرِ رہ گذر کسی کو ملے

کسی کو ہوتی مرے غم کی کیا خبر محسنؔ
کہ غم تو مجھ کو ملا نوحہ گر کسی کو ملے

☆

ظالموں میں یوں تو اونچا مرتبہ اس کا ہوا
یہ بھی لیکن دیکھئے انجام کیا اس کا ہوا

سب ملاتے ہی گئے آواز اُس آواز میں
تم تو کیا سارا زمانہ ہم نوا اُس کا ہوا

دیکھ کر تلوار اس کے ہاتھ میں سب چپ رہے
اس خموشی سے دوبالا حوصلہ اس کا ہوا

ساتھ میں سارے گھروں کے جل گیا اس کا بھی گھر
آگ بستی میں لگا کر کیا بھلا اس کا ہوا

قربِ منزل تک پہنچ کر تھا وہ سب کے ساتھ ساتھ
جانے پھر کیوں راستہ سب سے جدا اُس کا ہوا

اپنے اپنے راستوں میں ہم بھٹکتے ہی رہے
رہ نما میرا نہ کوئی رہ نما اُس کا ہوا

جنگ کی ہر بار محسنؔ ابتدا اُس سے ہوئی
اور ہمیشہ ہی زیاں مجھ سے سوا اُس کا ہوا

منزل بہت ہے دور حدِ جسم و جاں سے کیا
جانا ابھی ہے اور بھی آگے یہاں سے کیا

روشن جو ہو چکے ہیں سبھی پر وہ واقعات
بدلیں گے تیرے نطق سے تیری زباں سے کیا

ہم کو تو خود ہی دھوپ میں تپنا پسند ہے
شکوہ کسی شجر سے کسی سائباں سے کیا

گلشن میں جب تھے، ربط بہار و خزاں سے تھا
اب ہم ہیں دشت میں تو بہار و خزاں سے کیا

ہم تو کسی بھی لوح پہ کندہ نہیں ہوئے
ہم کو کسی بھی نام، کسی بھی نشاں سے کیا۔

ہم تو چلے تھے خود ہی مخالف ہوا کے ساتھ
جس سمت بھی چلے ہمیں موجِ رواں سے کیا

محسنؔ سنا گئی ہے سبھی کچھ زبانِ خلق
سننے کو رہ گیا ہے ہماری زباں سے کیا

ذکر کس دشتِ بے شجر کا ہے
یہ تو منظر اِسی نگر کا ہے

ہو چکا کب کا راندۂ درگاہ
وہ نہ اب گھاٹ کا نہ گھر کا ہے

صبح تک بجھ چکیں گے سب کے چراغ
کھیل سارا ہی رات بھر کا ہے

تشنہ لب دشت بھی ہیں دریا بھی
ایک سا حال خشک و تر کا ہے

پانوٗ میں ہو رہی ہے جنبش پھر
پیش خیمہ یہ کس سفر کا ہے

وہ جو آنی تھی آ چکی ہے خبر
انتظار اور کس خبر کا ہے؟

جس کو کہتے ہو اپنا گھر محسنؔ
نام کیا صرف بام و در کا ہے؟

☆

کوئی آباد تو برباد کوئی
یہاں کیا شاد کیا ناشاد کوئی

لٹے جو دشتِ غربت میں مسافر
شمار اُن کا نہ ہے تعداد کوئی

رہی لذّت نہ اب کوئی ستم میں
نیا ہو اب ستم ایجاد کوئی

میں اپنی آپ بیتی سن رہا تھا
کسی کی کب تھی وہ روداد کوئی

بنے ہیں سب مکاں ریگِ رواں پر
بنا جن کی نہ ہے بنیاد کوئی

رہے سوکھے کے سوکھے کھیت اپنے
ادھر آیا نہ ابر و باد کوئی

نہ جانے کب ملے کس کو رہائی
نہیں اس قید کی میعاد کوئی

مراسم سب ہیں منہ دیکھے کے محسنؔ
یہاں رکھتا ہے کس کو یاد کوئی

گھر سے نکلے تھے شب کے ڈھلتے ہوئے
جب دیئے بجھ رہے تھے جلتے ہوئے

زندگی ہم یہاں تک آ تو گئے
کہیں گرتے کہیں سنبھلتے ہوئے

واہمہ تھا کوئی بھی در پہ نہ تھا
جا کے دیکھا جب آنکھ ملتے ہوئے

شعلہ ساماں ہے میکدے کی فضا
جام ہاتھوں میں ہیں پگھلتے ہوئے

پھر تصوّر میں اِک نئی دنیا
وہی آنکھوں میں خواب پلتے ہوئے

ہم فقیروں کو ہے بہت محسنؔ
جو بھی مل جائے راہ چلتے ہوئے

زمانے سے ہوئے مجبور کیسے
ہوئے ہم خود سے اتنی دور کیسے

ہوئے کیوں کر نہ لفظوں میں بیاں ہم
خیالوں میں رہے محصور کیسے

حقائق پر بھی تھے کچھ خواب مبنی
ہوئے سب خواب چکنا چور کیسے

ہوا لب سے نہ حرفِ حق ادا کیوں
ہوئے اہلِ زباں مجبور کیسے

وہ منظر جو ابھی پیشِ نظر تھے
ہوئے آنکھوں سے اتنی دور کیسے

زباں بندی کا تھا جب حکم محسنؔ
تو ہوتی عرضِ غم منظور کیسے

ناقدِ فن کی سفارش کو نہیں مانتا میں
اُس کو ہم رتبۂ غالب نہیں گردانتا میں

یہ خطابات تو ہیں مظہر رسوائی انھیں
باعثِ عزّت و توقیر نہیں مانتا میں

تجھ کو پہچان لیا کچھ تھا سراپا ایسا
ورنہ وہ بھیڑ تھی خود کو بھی نہ پہچانتا میں

لکھّی ہوتی نہ اگر در بدری قسمت میں
اس طرح خاک کسی دشت کی کیوں چھانتا میں

سب کو جب شہر میں دعویٰ تھا خدا ہونے کا
سخت مشکل میں تھا، کس کس کو خدا مانتا میں

میری نظروں میں تو ہے صبح کا منظر محسنؔ
صبحِ کاذب ہے کہ صادق یہ نہیں جانتا میں

پاس مال و منال تھا پھر بھی
وہ بہت تنگ حال تھا پھر بھی

مل چکی تھی وہ شکل مٹی میں
عکس سا خال خال تھا پھر بھی

لاکھ چہرے تھے آئینوں کی طرح
شیشۂ دل میں بال تھا پھر بھی

سوچ تو تھی الگ الگ اپنی
وہ مرا ہم خیال تھا پھر بھی

جس کا تھا بس جواب خاموشی
وہی لب پر سوال تھا پھر بھی

سب کے منہ میں زبان تھی محسنؔ
لب ہلانا محال تھا پھر بھی

نام مرا چہار سو ذکر مرا زباں زباں
خاکِ نوائے غم مری اڑ کے گئی کہاں کہاں

اب کے شگفتِ گل میں بھی پائی نہ کچھ شگفتگی
اب کے صدائے غنچہ بھی ہم کو لگی گراں گراں

اُس کی نگاہِ لطف تو اور اداس کر گئی
خشک ہوئی کہ چشمِ نم قلب رہا تپاں تپاں

ہم کو تو کچھ ملا نہیں موجِ سراب کے سوا
ہم بھی گئے وہاں وہاں لوگ گئے جہاں جہاں

موسمِ نو بہار میں ایک بھی گل نہ کھل سکا
کیسا یہ معجزہ ہوا پھول کھلے خزاں خزاں

اس کی حد و بساط تو ارض و سماں سے بھی پرے
میری بساط یہ زمیں میری تو حد مکاں مکاں

☆

کس کی ہے تیغ کس کا ہے سر تم کو اس سے کیا
تم ہم نوائے خیر نہ شر تم کو اس سے کیا

اب ہم ہیں اور اک سفرِ دشت بے کنار
جتنا طویل ہو یہ سفر تم کو اس سے کیا

پابند تو نہیں ہیں کسی رہ گذر کے ہم
ہو یا نہ ہو اِدھر سے گذر تم کو اِس سے کیا

تم تو لگا کے آگ الگ جا کھڑے ہوئے
جل جائے اب کسی کا بھی گھر تم کو اس سے کیا

تنہا گذارنی ہے ہمیں جب یہ شامِ غم
اِس شام کی ہو جب بھی سحر تم کو اس سے کیا

باطل کے ساتھ کون ہے، حق پر یہاں ہے کون
تم تو نہ ہو اِدھر نہ اُدھر تم کو اس سے کیا

فصلِ خزاں سے کیا ہمیں موسمِ نو بہار کیا
ہم تو چمن پرست ہیں پھول کہاں کے خار کیا

قافلۂ بہار جب آئے ہمیں پکار لے
قافلۂ بہار کا راہ میں انتظار کیا

آگ لگی ہے کس طرف پھول کھلے ہیں کس طرح
دیکھئے آنکھ کھول کر رنگ ہے آرپار کیا

پھیلی ہوئی زمین پر ہم تو گذرتے ابر ہیں
چاہے جہاں برس گئے خاص کوئی دیار کیا

وقت بتائے گا کہ کون جنگ میں سرخ رو ہوا
آج کسی کی فتح کیا آج کسی کی ہار کیا

ہو گیا ہم پہ ختم کیا ظلم کا وہ جو دَور تھا
کھینچ چکے ستم سے ہاتھ اپنا ستم شعار کیا

محسنؔ اب آپ کیجیے کھل کے سبھی سے گفتگو
شعر کی قید و بند کیا لفظ کا یہ حصار کیا

کل جہاں ہر طرف تھے پھول ہی پھول
آج دیکھو تو ہر طرف ہیں ببول

پھر کسی سے سوال کیا کیجیے
ہو گیا جب جواب ہی موصول

ریت پر گھر سبھی بناتے رہے
ہم بھی کرتے رہے یہ کارِ فضول

اب تو ہم تیرے قرض دار نہیں
زندگی! دے چکے ترا محصول

منزلیں کیا ہیں بس غبارِ نظر
راستے کیا ہیں اپنے پانوٗ کی دھول

وہ کہانی تو کب کے ختم ہوئی
جس کہانی کو دے رہے ہو طول

تحفۂ برگِ سبز کیا محسنؔ
نہ ہوئی اپنی نذرِ جاں بھی قبول

☆

اک نظر ترجمانِ ذات و صفات
اک ادا کاشفِ رموزِ حیات

ایک جیسی کہانیاں ساری
ایک ہی جیسے سارے عنوانات

یہ زمیں تو ذرا بھی نم نہ ہوئی
چند بوندوں کو کہہ دیا برسات

جانے کس موڑ پر لٹے رہ رو
کچھ پتا ہی نہیں ہیں تفصیلات

اے اجل نذر اور کیا کرتے
پاس اپنے تھا صرف نقدِ حیات

شہر میں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں
گونگے بہرے ہیں سارے اخبارات

محسنؔ اب کے تو وہ اندھیرا ہے
سوجھتا ہی نہیں ہے ہات کو ہات

دیا جو موڑ پہ جلتا ہوا لگے ہے مجھے
کسی کا جیسے کوئی نقشِ پا لگے ہے مجھے

یہ کون پھولوں کو کھلتے ہی توڑ لیتا ہے
کچھ اس میں سازشِ دستِ صبا لگے ہے مجھے

سمجھ رہا ہے کمندِ ہوا کو حلقۂ گل
عجب فریب میں وہ مبتلا لگے ہے مجھے

یہ کون توڑ رہا ہے حصار خاموشی
نہ کوئی سنگ، نہ کوئی صدا لگے ہے مجھے

دیارِ غیر میں اس طرح کون ملتا ہے
یہ شخص اپنا کوئی آشنا لگے ہے مجھے

ہوا نہ اُس کے سوا کوئی لب کُشا محسنؔ
وہی بس ایک مِرا ہم نوا لگے ہے مجھے

کیا ضروری یہاں تھا گھر ہونا
جب یہاں سے تھا در بدر ہونا

جا بہ جا سر کو جا کے ٹکرانا
کسی دیوار میں نہ در ہونا

ہر قدم پر وہ دھوپ کی یورش
راستوں کا وہ بے شجر ہونا

دوڑنا بھاگنا وہ دن دن بھر
رتجگا رات رات بھر ہونا

سنتے سنتے وہ نیند آجانا
وہ کہانی کا مختصر ہونا

وہ صفِ دوستاں بکھرتی ہوئی
وہ سبھی کا اِدھر اُدھر ہونا

وہ ہر اک مورچے پہ پسپائی
وار کوئی نہ کار گر ہونا

کیسے گذرے گی یہ پہاڑ سی رات
کوئی آساں نہیں سحر ہونا

محسنؔ اُس کی وہ دشمنی خود سے
وہ بلا بن کے اپنے سر ہونا

ایک نامکمل غزل

کبھی امرت تو کبھی زہر بھی پی لیتے ہیں

یہ تو ہم ہیں کہ ہر اک حال میں جی لیتے ہیں

ویسے کب مصلحتِ وقت کی پروا ہے ہمیں

آپ کہتے ہیں تو ہم ہونٹوں کو سی لیتے ہیں

کسی اک رنگ پہ قائم ہی نہیں اپنا جنوں

چاک کرتے ہیں گریباں کبھی سی لیتے ہیں

بھول جاتے ہیں یہاں ڈوبتے سورج کو سبھی

چڑھتے سورج کا مگر نام سبھی لیتے ہیں

☆☆☆

متفرق اشعار

وہ جو تھا آنکھ کا تارا سب کا

وہی قاتل تھا ہمارا سب کا

رات ہی بھر کی چمک تھی ساری

بجھ گیا صبح ستارا سب کا

کیا تھی تصویر خیالی کوئی

جس کی جانب تھا اشارا سب کا

☆☆☆

نکل گئے مرے پانو سے خار آپ ہی آپ

مجھے تھا اُس کا مگر انتظار آپ ہی آپ

☆☆☆

رات اک غم کا سیلِ آب بہا

خوں رگِ دل سے بے حساب بہا

☆☆☆

اوروں کا کوئی عکس نہ تصویر ہوئے ہم

اپنے ہی ہر اک خواب کی تعبیر ہوئے ہم

جب حرف شناسی کا یہاں قحط پڑا ہے

کیوں صفحۂ قرطاس پہ تحریر ہوئے ہم

لے دے کے ہمیں سلسلہ دارانِ جنوں تھے

محصور ہوئے ہم کبھی زنجیر ہوئے ہم

☆☆☆

اپنے بیٹوں کے لئے

خوشی یہ ہے مرے شانہ بہ شانہ آ گیا کوئی

مرے مدِّ مقابل میرا جیسا آ گیا کوئی

☆☆☆

یہ اُفق تھا سحر آثار بہت پہلے سے

کر گیا تھا ہمیں بیدار بہت پہلے سے

روزِ اوّل سے تموّج تھا یہی دریا میں

ڈوب جانے کے تھے آثار بہت پہلے سے

آج اس صورتِ حالات پہ رونا کیسا

تھے یہی شہر پہ ادبار بہت پہلے سے

☆☆☆

یہی تو ہوگا ہمیں پائمال کر دیں گے
مٹا کے ہم کو مگر لازوال کر دیں گے

رہے گی آخرِ شب تک طلوعِ صبح کی فکر
اندھیرے گل تو نہ شمعِ خیال کر دیں گے

زمامِ وقت کو آنے دو اُن کے ہاتھوں میں
وہ ایک جیسا یہاں سب کا حال کر دیں گے

رکھیں گے یاد کہاں تک کہ ایک دن وہ ہمیں
سپردِ گردِ دنوں ماہ و سال کر دیں گے

حقیقتوں کو وہ کچھ دے رہے ہیں رنگ ایسا
حقیقتوں کو وہ خواب و خیال کر دیں گے

☆☆☆

آخری شعر

ہم نے خود کو تو بدلنے کی بہت کوشش کی
سخت حیرت ہے بدل جاتی ہے دنیا کیسے

☆☆☆

آخری مصرعہ

دور سے مجھ کو بلاتا ہے سمندر کوئی

☆☆☆

(انتقال سے ایک ماہ قبل بشیر فاروقی صاحب کی غزل سن کر اُسی طرح میں فی البدیہہ کہا گیا)

قطعۂ تاریخ وفات محسنؔ زیدی مرحوم

بدرالحسن زیدی

محسنؔ گئے تم ایسا اندھیرا سا چھا گیا
روئیں گے تم کو برسوں ابھی مہر و ماہ اور

گہری پرکھ، بلند نظر، تجربہ وسیع
لائے کوئی کہاں سے تمہاری نگاہ اور

تم تو دکھا کے ایک نئی راہ چل دیئے
دنیائے شعر ڈھونڈے کہاں سر براہ اور

بھائی تو تم پہ چھوڑ گئے خاندان سب
دنیا سے تم بھی کر نہ سکے کچھ نباہ اور

تھا کربلا سے عشق تو جلدی میں پڑ گئے
اب تم کو چاہیئے نہ تھی کچھ زادِ راہ اور

اشعارِ مدح دیں گے شہادت عقیدہ کی
رضواں کو پھر نہ چاہئے کوئی گواہ اور

اک غمزدہ کو فکر جو تاریخ کی ہوئی
صفحاتِ فکر ہو نہ سکے کچھ سیاہ اور

تاریخ نکلی گویا تمہارے کلام سے
مر کر بھی تم نے لوٹ لی کچھ واہ واہ اور

"محسن کسی کی جان سلامت نہیں یہاں" = ۱۰۴۴
یہ کیا کہ تم نے ڈھونڈ لی جائے پناہ اور = ۹۵۹

۲۰۰۳ء

☆☆☆☆
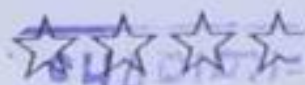
ناقدین کی رائے

محسن زیدی کی غزلیں پڑھ کر اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے محسوسات اور خیالات خود ان کے ہیں جنھیں انھوں نے اپنے ڈھنگ سے پیش کیا ہے، یہی بات ان کے اشعار میں اثر انگیزی کی ضامن بن جاتی ہے .... سید احتشام حسین

محسن صاحب روایتی غزل نہیں کہتے، اپنے دور کے آفریدہ ہیں لیکن وہ خالص جدیدیے بھی نہیں۔ اپنی سلیم الطبعی کے باعث انھوں نے جدیدیت سے قابل قدر افکار واظہار کو لے لیا۔ لیکن ابہام یا اقدار شکنی سے مبرّا رہے۔ انھوں نے بالعموم طرز اظہار سے پرہیز کیا ہے اور براہ راست طریقہ اختیار کیا ہے .... ڈاکٹر گیان چند جین

محسن زیدی نے مروّج اور معتبر شعری لفظیات کے دائرے سے نکل کر نہیں، اس دائرے میں رہ کر ہی اپنی بات کہنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے لہجے کی تازگی لفظوں کے نئے پن کی نہیں، ان واردات کی مرہون منت ہے جو نجی اور شخصی ہیں اور عصری زندگی کی دین ہیں .... مخمور سعیدی

محسن نے غزل کے مروّج ذخیرہ الفاظ میں بڑے غیر محسوس طور پر اضافے کئے ہیں۔ بعض پرانے الفاظ واسالیب کو نئی معنوی جہات دی ہیں۔ اس نے الفاظ واسالیب کے بے مقصد اختراع وتخریب کو لائق اعتنا نہیں سمجھا۔ اس کے نزدیک شاعری ایسا فن ہے جو نیا انداز ہنر مانگے ہے اور اس ہنر کا شعر کے ظاہر اور باطن دونوں کی تہذیب سے بڑا گہرا تعلق ہے .... راج نرائن راز